8402

DATE LABEL

2 OCT 1980

08 FEB 2007

21 FEB 2007

Call No ________ *Date* ________

Acc. No. 34082

UNIVERSITY OF KASHMIR
LIBRARY

This book should be returned on or before the last date stamped above. An over-due charge of 10/20 Paise will be levied for each day, if the book is kept beyond that date.

ہندوستان میں فرنگیوں کی عیاری اور مکاری کی تاریخی سرگذشت

انگریز کا شرمناک دورِ حکومت

جسکے ساتھ ہندوستان کی بیداری کی تاریخ بھی شامل ہے

اِس تاریخ میں بتایا گیا ہے کہ انگریزوں نے کِس عیاری اور مکاری کے ساتھ برِّ صغیر ہندوستان پر قبضہ جمایا تھا۔ یہ تاریخ ۱۴۹۸ء کے اُس منحوس سال سے شروع ہوتی ہے جبکہ آج سے ساڑھے چار سو برس قبل سفید رنگ کے پہلے شخص نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ ۱۴۹۸ء کے بعد یہ تاریخ مختلف دوروں سے گذرتی ہوئی ۱۹۴۷ء کے اُس تاریخی سال پر ختم ہوتی ہے جب ہندوستان انگریز کی غلامی سے آزاد ہوا اور اس برِّ عظیم میں مملکتِ ہند اور مملکتِ پاکستان کے نام سے دو آزاد اور خودمختار حکومتیں قائم ہوئیں۔ انگریزوں کی عیاری اور مکاری کے واقعات کے ساتھ ہندوستان کی سیاسی بیداری کی تاریخ بھی اس تاریخ کے آخر میں شامل ہے

از

مفتی شوکت علی فہمی

شائع کردہ:۔ دین دنیا پبلشنگ کمپنی۔ جامع مسجد۔ دہلی

جدید ایڈیشن

۹۵۴.۵۳
ف 1322

شائع کردہ

دین دنیا پبلشنگ کمپنی

جامع مسجد دہلی

قیمت: تین روپے چار آنے

مطبوعہ دہلی پرنٹنگ ورکس دہلی

ابواب

جملہ حقوق محفوظ

اس تاریخ کی ترتیب۔ تحریر اشاعت اور طباعت
کے جملہ حقوق بحق شوکت علی فہمی پروپرائیٹر
دین دنیا پبلشنگ کمپنی محفوظ ہیں۔ لہذا کوئی
صاحب اس تاریخ کے کسی حصہ کی بھی نقل و
اشاعت کی کوشش نہ فرمائیں

JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY
No 34082
Date 11-8-60
STO1
MB

فہرستِ مضامین

پہلا باب

ہندوستان پر مغربی اقوام کی یورش

دوسرا باب

ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کی ابتدا

تیسرا باب

انگریزوں کا شرمناک دورِ حکومت

چوتھا باب

انگریزی حکومت کا آخری دور

دِیباچہ

ہندوستان کا برِ صغیر اگرچہ انگریز کے پنجۂ استبداد سے نکل چکا ہے اور یہاں ہند اور پاکستان کے نام سے دو آزاد اور خود مختار مملکتیں قائم ہو چکی ہیں۔ لیکن آج بھی انگریز اور دوسری سفید فام مغربی قومیں اس برِ صغیر کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہیں اور ایسی شطرنجی چالیں چل رہی ہیں۔ جن کے ذریعہ ان دونوں مملکتوں کو اگر فوجی لحاظ سے نہیں تو اقتصادی اعتبار ہی سے قابو میں رکھا جا سکے تاکہ مغربی قومیں اس برِ صغیر سے بیش از بیش فوائد حاصل کر سکیں۔

مغرب کی سفید فام قوموں کی ان ابلہ فریبیوں کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کی اُن سفید فام باشندوں کو بالکل عُریاں کر دیا جائے جو ڈیڑھ سو برس تک برابر ہمارا خون چُوستے رہے ہیں۔ اور جنہوں نے بھُوکے اور ننگے ہندوستانیوں کی ہڈیوں پر اپنا قصرِ شاہی تعمیر کیا تھا۔ آج جبکہ یہ برِ صغیر عیارانِ مغرب کے پنجہ استبداد سے نکل چکا ہے تو یہ دیکھ کر ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے یہی ازلی دشمن اپنے آپ کو ہمارا بہترین دوست اور عاشقِ صادق ظاہر کر رہے ہیں محض اس لئے تاکہ دوستی اور عشق کا تازہ فریب دیکر یہ ہمارا مزید خون چوس سکیں۔

وطنِ عزیز کو ان عیاروں اور دھوکہ بازوں سے بچانیکے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا

ہے کہ اِن کو بالکل بے نقاب کر دیا جائے۔ تاکہ ان کی اصلی تصویر ملک کے سامنے آجائے اور ہمارے ابنائے وطن دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کر سکیں۔ اور ہماری آئندہ نسلیں بھی اُن سفید فام عیاروں کی عیاریوں سے باخبر ہو جائیں، جو صدیوں تک ہماری مادرِ وطن کے خون سے ہاتھ رنگتے رہے ہیں۔ چنانچہ اسی بلند وبالا مقصد کے پیشِ نظر یہ تاریخ شائع کی جا رہی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۴۹۸ء کا وہ سال نہایت ہی منحوس تھا۔ جبکہ مغرب کے پہلے سفید فام باشندے واسکوڈی گاما نے اِس برِّ صغیر کی مقدس سرزمین کو اپنے نجس قدموں سے ناپاک کیا۔ اس ایک واسکوڈی گاما کے بعد بے شمار واسکوڈی گاما۔ پرتگیزوں ولندیزوں، انگریزوں اور فرانسیسیوں کی شکل میں برابر ہندوستان کو لوٹنے کے لئے آتے رہے اور ہندوستان میں اپنی غارتگری کے اڈے قائم کرتے رہے۔

مغربی قوموں کی ہندوستان کے خلاف یورشیں یوں تو زمانۂ دراز سے جاری تھی لیکن صحیح معنوں میں ہندوستان کی بدبختی کی ابتدا اُس وقت سے شروع ہوئی۔ جب انگریز دوسری تمام سفید فام قوموں کو شکست دینے کے بعد اور ۱۷۵۱ء میں کرناٹک کی تیسری جنگ میں فتحیاب ہو کر اس برِّ عظیم میں طاعون اور وبائی امراض کی طرح پھیلنے شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے رفتہ رفتہ سارے ہندوستان پر قبضہ جما لیا اور انتہائی بے دردی کے ساتھ غریب ہندوستانیوں کی ہڈیوں پر برطانوی حکومت کے سنگلاخ قلعے تعمیر کر دئے۔

سکندرِ اعظم، چنگیز خاں، تیمور، نپولین اور دوسرے بے شمار بڑے بڑے فاتح دنیا میں پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی غیر معمولی سپاہیانہ طاقت کے بل پر ملک کے ملک فتح کر کے رکھ دئے ہیں۔ لیکن انگریز ان فاتحانِ عالم سے بالکل مختلف ہے کیونکہ

دوسرے فاتحین نے تو جرأت اور بہادری کے ذریعہ فتوحات حاصل کی ہیں لیکن انگریز نے چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح ممالک پر قبضہ جمایا ہے۔ انگریز کی عیاری اور مکاری کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ وہ روٹی کے چند ٹکڑوں کی خاطر ہندوستان میں تاجر کا بھیس بدل کر داخل ہوا لیکن بعد کو اس نے اپنے ان ہی محسنوں کے گھروں میں آگ لگا دی جنہوں نے کہ اس کی نازک ترین وقت میں شکم پروری کی تھی۔

انگریزوں کی ابن الوقتی اور محسن کشی ملاحظہ ہو کہ انگریزوں کا محسن اعظم نواب انور الدین والئی کرناٹک تھا جس نے کہ اس برِ صغیر میں انگریزوں کے قدم جمائے لیکن انگریز نے طاقت حاصل ہوتے کے ساتھ ہی سب سے پہلے اپنے اسی سب سے بڑے محسن کا گلا گھونٹ دیا۔ اور اسکی اولاد سے تخت و تاج چھین کر انھیں دو دو دانہ کے لئے محتاج کر دیا۔ نواب کرناٹک کے بعد نظام دکن انگریزوں کا دوسرا محسن تھا لیکن انگریزوں نے اقتدار حاصل ہوتے ہی خود بھی نظام کو بُری طرح چھلا اور مرہٹوں سے بھی اچھی طرح چھلوایا۔ غرضکہ انگریز کے ساتھ جس نے بھی احسان کیا۔ انگریز نے موقعہ ملتے ہی اُسے مٹانے کے لئے کوئی کمی نہیں اُٹھا رکھی۔

انگریز صرف محسن کش ہی نہیں ہے بلکہ وہ انتہا درجہ کا عیار اور مکار بھی ہے چنانچہ محبِ وطن سراج الدولہ والی بنگال کے خلاف سازش کرکے انگریزوں نے جس عیاری کے ساتھ اُسے قتل کرایا ہے وہ انگریز قوم کے پست کیرکٹر کا نہایت ہی شرمناک نمونہ ہے۔ اسی طرح انگریزوں نے شہزادہ میرن کا حب الوطنی کے جرم میں جس سفاکی کے ساتھ خون بہایا ہے۔ وہ انگریزوں کے گرے ہوئے کردار کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے اپنے دوستوں یعنی میر جعفر نظام دکن۔ نواب اودھ اور مغل بادشاہ کے ساتھ جو کمینہ سلوک کیا ہے اس سے صاف

پتہ چلتا ہے کہ انگریز کا کردار کس قدر گرا ہوا ہے۔ مزید برآں انگریز نے سلطان ٹیپو۔ مرہٹوں۔ روہیلوں، پنڈاریوں اور دوسری مقتدر طاقتوں کو ختم کرنے کے لئے مکّاری کے جو حربے استعمال کئے ہیں۔ اس کی مثال شائد ہی دُنیا کی تاریخ میں مل سکے۔

انگریزوں کی محسن کشی ظلم و ستم اور فریب کاری ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ہندوستان کے کونے کونے میں انگریز کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اور ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے محبانِ وطن ناسازگار حالات کے باوجود انگریزوں کو اس برِصغیر سے نکالنے کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ انگریز نے اگر اپنی فطری عیاری سے کام لیکر خود ہندوستانیوں ہی کو وطن اور ملک کے ساتھ غداری کے لئے آمادہ نہ کر لیا ہوتا تو ہندوستان ۱۸۵۷ء ہی میں آزاد ہو چکا تھا لیکن ہندوستان کی بدقسمتی کہ انگریز کے پیدا کردہ غدارانِ وطن کی بدولت انگریزوں کو دوبارہ ہندوستان میں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ ہندوستان پر دوبارہ اقتدار حاصل ہونے کے بعد انگریز نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصّہ لینے والے محبانِ وطن کے ساتھ جو ظالمانہ برتاؤ کیا ہے وہ تاریخ کا سیاہ ترین ورق ہے۔

۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک کے ناکام ہونے کے بعد انگریزی حکومت اِس برِصغیر میں باقی تو رہی لیکن اُس کی بنیادیں کیونکہ ہل چکی تھیں۔ اس لئے انگریز ہندوستانیوں کو بھی ہندوستان کی حکومت میں تھوڑا بہت حصّہ دینے پر مجبور ہو گیا۔ تاکہ اس طرح وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی مدّت کو زیادہ سے زیادہ طول دے سکے۔ اس مقصد کے لیے ہندوستانیوں کو اصلاحات یعنی اختیارات منتقل کرنے کا کام سب سے پہلے ۱۸۹۲ء میں انڈین کونسلز ایکٹ کے پاس ہونے کے بعد شروع ہوا۔

انگریز کی اس فیّاضی اور دریا دلی میں بھی کتنا بڑا مکر اور فتنہ چھپا ہوا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے فرما لیجئے کہ انگریز نے جب اور جس وقت بھی اصلاحات عطا فرمائی ہیں اُن میں فرقہ پرستی کا زہر ضرور شامل کر دیا ہے تاکہ ان اصلاحات سے ہندوستانی کوئی فائدہ ہی نہ اُٹھا سکیں چنانچہ ۱۸۹۲ء کی اصلاحات کے بعد ۱۸۹۳ء میں انگریز نے خوب فرقہ وارانہ ہنگامے برپا کرائے۔ اسی طرح ۱۹۰۹ء کی منٹو مارلے اصلاحات کے بعد تقسیم بنگال کا ایک نیا فتنہ کھڑا کر دیا۔ جس کی بدولت نہ صرف بنگال بلکہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں شدید منافرت پھیل گئی۔ اس کے بعد ۱۹۱۹ء میں جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رُو سے جدید اصلاحات عطا کی گئیں اور ان کا نفاذ ۱۹۲۱ء میں ہوا تو انگریز کی جادوگری نے سارے ملک میں فرقہ وارانہ ہنگاموں کی آگ بھڑکا دی۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں ہندو اور مسلمانوں نے اچھی طرح سے ایک دوسرے کا خون بہایا۔ اور یہ خوں ریزی اتنی بڑھی کہ گاندھی جی اور ملک کے تمام مقتدر لیڈر سیاسیات سے کنارہ کش ہونے پر مجبور ہو گئے۔

انگریز کی اس فتنہ پردازی کے باوجود بھی ہندوستان میں سیاسی بیداری برابر بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ انگریز ۱۹۳۵ء میں جدید اصلاحات کے ذریعہ صوبجاتی خود مختاری دینے پر مجبور ہو گیا لیکن انگریز کی عطا کردہ ان اصلاحات کا ابھی نفاذ بھی نہیں ہوا تھا کہ اس مغربی عیار نے مسجد شہید گنج کا ایک بہت بڑا فتنہ پنجاب میں کھڑا کر دیا جس کی وجہ سے ایک فرقہ نے دوسرے فرقہ کی بڑی بے دردی سے گردنیں کاٹیں۔ اس کے بعد جب ۱۹۳۷ء میں یہ اصلاحات نافذ ہو گئیں اور صوبائی وزارتیں بن گئیں تو ہندوستان کے تقریباً ہر صوبہ میں انگریز کی عنایت سے ہندوؤں نے مسلمانوں کا اور مسلمانوں نے ہندوؤں کا خون بہانا شروع کر دیا۔ اور یہ سلسلہ ایک دو دن نہیں بلکہ مہینوں جاری رہا۔

انگریز کی فتنہ پردازی کی سب سے بڑی اور آخری مثال وہ خوں ریزی اور غارت گری

ہے۔ جو ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ باخبر حضرات اس سے ناواقف نہیں کہ سیاسی حالات سے مجبور ہو کر انگریز ۱۹۴۶ء میں ہندوستان میں انٹیریم گورنمنٹ بنانے پر مجبور ہو گیا اور ۱۹۴۷ء میں اُسے سینہ پر پتھر رکھ کر ہندوستان کو آزاد کر دینا پڑا۔

۱۹۴۶ء کی اصلاحات کی قسط کیونکہ مکمل آزادی کا پروانہ تھا اور جو انگریز کی عطاکردہ سب سے بڑی قسط تھی، اس لئے خوں ریزی اور تباہ کاری کی قسط بھی اتنی ہی شاندار ہونی چاہیئے تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا یعنی ۱۹۴۶ء میں ابھی برائے نام قومی حکومت قائم ہی ہوئی تھی کہ انگریز کی عشوہ گری کی بدولت صوبہ بہار میں پوری بے دردی کے ساتھ ایک فرقہ نے دوسرے فرقہ کا خون بہایا اور قتلِ عام کیا۔

۱۹۴۶ء کی اس شرمناک خوں ریزی کے بعد ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے آزاد ہونے سے عین قبل ہی پنجاب میں بنی نوع انسان کا خون پانی کی طرح بہایا جانے لگا۔ پنجاب کی اس تاریخی خوں ریزی کا سہرا حکومتِ انگلشیہ کے فرزند دلبند لفٹنٹ جنرل خضر حیات خاں سابق وزیرِ اعظم پنجاب کے سر ہے جس نے انگریز گورنر کے اشارہ پر پنجاب میں فرقہ پرستی کی وہ آگ بھڑکائی جو برابر بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد اس برِ صغیر میں جب ہندو پاکستان کے نام سے دو خود مختار مملکتیں قائم ہو گئیں۔ تب بھی فرقہ پرستی کی یہ آگ نہ دب سکی۔ بلکہ اور زیادہ بھڑک گئی۔ غرضکہ یہ آگ مغربی پنجاب سے مشرقی پنجاب میں اور مشرقی پنجاب سے دیسی ریاستوں میں اور وہاں سے دہلی تک جا پہنچی۔

یہ امر واقعہ ہے کہ اس خطرناک اور نازک وقت میں انگریز کی لگائی ہوئی اس آگ کو دبانے کے لئے اگر گاندھی جی نے اپنی جان کی بازی نہ لگا دی ہوتی تو یقینی طور پر یہ آگ ہندوستان اور پاکستان کی دونوں مملکتوں کو پھونک کر رکھ دیتی لیکن پھر بھی ہندو

پاکستان کی دونوں مملکتوں کو اس خوفناک فرقہ پرستی کی بدولت سخت نقصان اُٹھانا پڑا۔ انگریز کی پیدا کردہ اسی فتنہ پردازی کا یہ نتیجہ تھا کہ ہندوستان کے کروڑوں باشندے بے گھر اور بے در ہو گئے۔ دونوں مملکتوں کو تبادلہ آبادی کی اُس مصیبت سے دوچار ہونا پڑا جس نے کہ ان دونوں نوزائیدہ مملکتوں کی بنیادوں کو ہلا ڈالا۔ اِن حقائق سے یہ اندازہ لگانا دُشوار نہیں کہ انگریز کا وجود ہمیشہ ہی ہندوستان کے لئے کس قدر خطرناک ثابت ہوتا رہا ہے اور اس نے جاتے جاتے بھی ہماری مادرِ وطن کی پشت میں جو خنجر بھونکا ہے وہ کس قدر خطرناک ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اب یہ برّ صغیر انگریز کی لعنت سے آزاد ہو چکا ہے اور یہاں کی دونوں مملکتیں یعنی ہند و پاکستان مغرب کی ابلہ فریبیوں کے باوجود بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی جانب گامزن ہیں لیکن پھر بھی ان دونوں مملکتوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ مغرب کا وہ شکاری جس کے منھ کو ہندوستان کا خون لگا ہوا ہے۔ اب بھی ان دونوں مملکتوں کو بدستور للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اور اس فکر میں ہے کہ ان دونوں مملکتوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر ختم کر دیا جائے۔

ہند و پاکستان اگر اپنی آزادی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ان کو ایک طرف مغرب کے ساحروں سے خبردار رہنا چاہیئے۔ اور دوسری طرف آپس میں متحد ہو جانا چاہیئے کیونکہ ان دونوں مملکتوں کی دائمی آزادی اور خوش حالی کے لئے یہ ضروری ہے کہ نہ صرف ان دونوں مملکتوں میں بلکہ ان کے باشندوں میں بھی ایسا اتفاق اور اتحاد قائم ہو جائے کہ ایک ہندوستانی اور پاکستانی میں کوئی فرق باقی نہ رہے تاکہ وہ بیرونی طاقتیں جو ان دونوں آزاد مملکتوں سے ناجائز فوائد حاصل کرنے کے لئے شطرنجی چالیں چل رہی ہیں اُنھیں مایوسی اور ناکامی کا منھ دیکھنا پڑے۔

یہ حقیقت ہے اور اس حقیقت سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں

مملکتوں کے باشندوں میں جو ایک ہی مادرِ وطن کے فرزند ہیں۔ اب پہلے سے کہیں زیادہ اتحاد کی ضرورت ہے کیونکہ پہلے تو ہم صرف اینٹوں۔ پتھروں۔ سوڈے کی بوتلوں اور لاٹھیوں سے لڑا کرتے تھے۔ لیکن اب ہمارے پاس توپ و تفنگ اور تباہ کن ہوائی جہاز بھی ہیں جن کے ذریعہ ہم آسانی کے ساتھ اپنی دونوں مملکتوں کو خانہ جنگی کے ذریعہ تباہ کر سکتے ہیں۔ ہم کو اُمید ہے کہ دونوں آزاد مملکتوں کے باشندے اور لیڈر اس تاریخ سے سبق حاصل کریں گے اور کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھائیں گے جو خودکشی کے ہم معنی ہو۔

شوکت علی فہمی

The J & K University Library
Acc. No. 34082

چند تمہیدی جملے

مغربی اقوام کی وہ یورش جو کئی صدی قبل سے ہندوستان کے خلاف جاری تھی۔ اُسی کا یہ نتیجہ تھا کہ سات سمندر پار کی انگریز قوم نے ہندوستان جیسے برِ صغیر پر غاصبانہ قبضہ جما کر اس ملک کے اصلی اور حقیقی باشندوں کو نہ صرف حکومت سے بلکہ آزادی کے حق سے بھی محروم کر دیا تھا۔

انگریزوں نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جس وقت آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ کو گرفتار کر کے رنگون جلاوطن کیا۔ اُس وقت انگریز شمال سے لیکر جنوب تک اور مشرق سے لے کر مغرب تک سارے ہندوستان کے مالک و مختار بن چکے تھے۔ مغلیہ حکومت تو زمانۂ دراز سے لبِ دم تھی۔ لیکن انگریزوں نے انتہائی عیاری کے ساتھ اُن تمام دوسری طاقتوں کو بھی کچل ڈالا جو مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد اس طرح اُبھری تھیں کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب ان کا دبانا ناممکن ہے اور وہی آگے چل کر مغلیہ حکومت کی جانشین ثابت ہوں گی۔

انگریزوں نے کس عیاری اور مکاری کے ساتھ ہندوستان کی مقتدر طاقتوں کو کچلا ہے۔ اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئے گی۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ شمال و مغرب

میں افغانوں کا زور ختم ہو گیا۔ مرہٹوں کی طاقت جنوب میں پاش پاش کر دی گئی روہیلے جو روہیلکھنڈ اور اودھ پر چھا چکے تھے۔ اُن کا زور ٹوٹ گیا۔ راجپوت جنہوں نے مغلیہ حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے راجپوتانہ کے بیشتر علاقہ پر قبضہ جما لیا تھا۔ وہ بھی انگریزوں کے مطیع بن گئے۔ نظام جو دکن کا بادشاہ بنا ہوا تھا۔ انگریزوں کا باجگذار بن گیا۔ اُمرائے بنگال۔ بہار۔ اُڑیسہ اور اودھ کی ساری امارت اور طاقت ختم ہو گئی۔ سکھ اور جاٹ جو دہلی سے لے کر پنجاب تک قابض ہو گئے تھے وہ بھی انگریزوں کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ غرضکہ انگریز نے نہ صرف تلوار کے زور سے بلکہ عیاری اور ابن الوقتی سے بھی کام لے کر ہندوستان کی تمام شجاع اور بہادر قوموں کو اس طرح فنا کر کے رکھ دیا کہ وہ زمانۂ دراز تک نہ اُبھر سکیں۔

انگریزوں نے جس مکاری اور چالاکی کے ساتھ ہندوستان پر قبضہ جمایا وہ ملک گیری کا ایک ایسا شرمناک نمونہ ہے جس سے تاریخ عالم قطعی ناآشنا تھی۔ یہ ہندوستان میں تاجر کا بھیس بدل کر آئے۔ مغل حکمرانوں نے ان کو تجارت کے خاص حقوق دیئے۔ اور انھوں نے ہندوستان کی تجارت سے بے اندازہ دولت کمائی۔ لیکن ان کی احسان ناشناسی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اُسی مغلیہ حکومت کی بُنیادوں کو کھودنا شروع کر دیا جس نے پرتگیزوں ولندیزوں اور فرانسیسیوں کے مقابلہ میں ان کو خاص مراعات دیکر ان پر احسانِ عظیم کیا تھا۔

انگریز کی عیاری اور مکاری کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب ان کو سورت اور دیگر مقامات پر تجارتی کوٹھیوں کے تعمیر کرنے کی اجازت مل گئی تو انھوں نے اپنی تجارتی کوٹھیوں کے نام سے فوجی قلعے بنا ڈالے اور حفاظتی چوکیداروں کے نام سے تربیت یافتہ فوجی سپاہیوں کو ان قلعوں میں یوروپ سے لاکر بھر دیا۔ چنانچہ ان ہی "تجارتی کوٹھیوں" اور "حفاظتی چوکیداروں" کے ذریعہ انھوں نے موقعہ ملتے ہی ہندوستانی علاقوں پر

ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے "آپس میں لڑاؤ اور اپنا اُلّو سیدھا کرو" کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے خود ہندوستانیوں سے ہندوستانیوں کی گردنیں کٹوائیں اور اس طرح یہ سارے ہندوستان کے بادشاہ بن بیٹھے۔

ہم کو اس چیز کا اعتراف ہے کہ ہندوستان کے حکمرانوں نے اپنی سادہ لوحی کی بنا پر ان عیار "تاجروں" کے سمجھنے میں بڑی غلطی کی۔ اگر ابتدا ہی میں ان کو کچل دیا جاتا تو ان ابن الوقتوں کو اُس نازک وقت میں ہاتھ پاؤں نکالنے کا موقعہ ہی نہ مل سکتا۔ جبکہ ہندوستان کی حکومت زوال پذیر تھی لیکن ہندوستان کے حکمراں ان کو بزعم خود بے حقیقت سمجھتے رہے۔ اور یہ رفتہ رفتہ اندر ہی اندر حکومت سازی کا خطرناک پروگرام بناتے رہے۔

شاہجہاں۔ اورنگزیب اور بہادر شاہ اوّل نے اگر ان کی جانب توجہ بھی کی تو اس طرح کہ اگر ایک مرتبہ پوری طاقت سے ان کے خلاف یورش کی گئی تو دوسری بار ان پر غیر ضروری نوازشات کا دروازہ بھی کھول دیا گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہندوستانی حکمرانوں نے اِن عیّاروں پر گہری نظر رکھی ہوتی تو ہندوستان کی موجودہ تاریخ بالکل بدلی ہوئی دکھائی دیتی لیکن ہندوستان کی بدقسمتی کہ اسے ڈیڑھ سو برس تک ان سمندر پار کے تاجروں کی بھی غلامی کرنی پڑی۔

اس تمہید کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی مزید انتظار کے بغیر اس کتاب کے ناظرین کو حقائق سے آگاہ کر دیا جائے اور یہ بتا دیا جائے کہ یورپ کے یہ سفید فام تاجر کس طرح ہندوستان آئے۔ اور یہ بادشاہ بننے سے قبل کس طرح ہندوستان میں قزاقی کرتے رہے ہیں۔ پھر یہ قزّاق کس طرح ہندوستان کے بادشاہ بن بیٹھے ہم سب سے پہلے اُن دوسری سفید فام اقوام پر روشنی ڈالیں گے جو ہندوستان پر برابر یورش کرتی رہی ہیں۔ اسکے بعد انگریزوں کی عیّاریوں اور ابلہ فریبیوں کو بے نقاب کرینگے۔

پہلا باب

ہندوستان پر

مغربی اقوام کی یورش

۱۴۹۸ء تا ۱۷۵۲ء

مغربی اقوام کی یورش

ہندوستان پر یورش کرنے والے تنہا وہ انگریز ہی نہیں ہیں جو ہندوستان میں تجارت کرتے کرتے ہندوستان کے تاجدار بن بیٹھے۔ بلکہ انگریزوں کی آمد سے بہت قبل متعدد یورپین ممالک برابر ہندوستان پر "تاجرانہ" چڑھائی کرتے رہے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ آخر میں میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا اور بقیہ یورپین ممالک رفتہ رفتہ میدان سے ہٹ گئے یا انگریزوں نے مار مار کر اُن کو میدان سے بھگا دیا۔

انگریزوں کو مشرق میں لُوٹ اور غارتگری کا راستہ دکھانے والا ملک وہ پُرتگال ہے جس پر مسلمان آٹھ سو برس تک حکومت کر چکے تھے۔ اور جس کو عرب ملاحوں نے سمندر کا سینہ چاک کرنے کا فن سکھایا تھا۔

پرتگالیوں نے عرب کے ملاح استادوں کے سامنے زانوئے اَدب تہہ کرنے کے بعد فن ملاحی میں تمام یوروپین ممالک میں ایک امتیازی درجہ حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ پرتگیزوں کو سکھایا ہوا عربوں کا یہ فن مشرق کے لئے آگے چل کر مصیبت بن گیا۔ مصیبت بھی اتنی بڑی کہ جس نے مشرق کی تاریخ کو بدل کر رکھدیا چنانچہ عرب ملاحوں کی بدولت ہی سب سے پہلے پرتگیز ہندوستان پہنچے اور ان کے ہندوستان پہنچنے کے بعد مغرب کے تمام رہزنوں کے لئے رہزنی کا ایک نہایت وسیع میدان مشرق میں ہاتھ آگیا۔

ہندوستان میں پرتگیزوں کی آمد

۱۴۹۸ء ہندوستان کی تاریخ کا وہ منحوس سال ہے۔ جب سفید رنگ کے پہلے انسان نے یعنی پُرتگال کے مشہور ملاح واسکوڈی گاما نے ہندوستان

کی سرزمین پر قدم رکھا۔ واسکوڈی گاما ایک عرب ملاح کی مدد سے افریقہ کا چکر کاٹتا ہوا اور راس اُمید کے پاس سے گذرتا ہوا کالی کٹ کے مقام پر پہنچا۔ غرضکہ اس نئے دریافت شدہ راستہ نے سفید رنگ کے انسانوں کو ایک ایسے خوشحال ملک میں پہنچا دیا جس کی خوشحالی اور دولتمندی کے افسانے پریوں کی کہانیوں کی طرح یورپ کے ہر ملک میں مشہور تھے۔

جس زمانہ میں واسکوڈی گاما نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان پر سکندر لودھی حکمرانی کر رہا تھا۔ اور کالی کٹ میں راجہ زمورن کی حکومت تھی۔ راجہ زمورن نے اپنے اس سفید مہمان کو ہاتھوں ہاتھ لیا صنعت و تجارت کے دروازے پرتگیزوں کے لئے کھول دئے۔ زمورن اور واسکوڈی گاما میں دوستی کے عہد و پیمان ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان اور پرتگال میں ایک زبردست تجارتی رشتہ قائم ہو گیا۔

پرتگیزوں کے ہندوستان آنے سے قبل عرب اور مصری بلا شرکت غیرے ہندوستان کی تجارت پر حاوی تھے۔ اس لئے انھوں نے پرتگیزوں کی سخت مزاحمت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرتگیزوں کی مصریوں اور عربوں سے لڑائیاں چھڑ گئیں۔ لیکن پرتگیزوں نے چند سال کے اندر ہی عربوں اور مصریوں کو ہندوستان کے سمندر سے نکال دیا۔

پرتگیزوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے ۱۵۰۷ء میں اپنے محسن راجہ کالی کٹ کے ساتھ غداری کرتے ہوئے اُس کی حکومت کی بُنیادیں کھود ڈالیں۔ کالی کٹ اور گوا پر غاصبانہ قبضہ جما لیا اور وہاں اپنے تجارتی قلعے بنا لئے۔ اور ان پر پرتگیزی جھنڈا لہرا دیا۔ چنانچہ آج بھی ہندوستان میں گوا۔ دمن اور دیو۔ جو پرتگیزوں کی سابقہ غاصبانہ یادگاریں ہیں۔ اس ملک میں ان ہی کے مقبوضے

شمار کئے جاتے ہیں۔

انگریز اور ولندیزی بھی آگئے

ہندوستان کی دولت نے چند ہی سال کے اندر جب پرتگال اور اسپین کو رشک جناں بنا دیا تو یورپ کا تقریباً ہر ملک یہ سوچنے لگا کہ ہندوستان پر کس طرح ہاتھ صاف کیا جائے۔ دولت کی طمع یوں تو فرانس جرمنی اور بہت سے یورپین ممالک کے باشندوں کو ہندوستان کھینچ لائی تھی لیکن پرتگال کے بعد جن دو ملکوں نے سب سے پہلے ہندوستان پر پوری طاقت اور تیاری کے ساتھ یورش کی وہ انگلستان اور ہالینڈ تھے۔ چنانچہ ۱۶۰۰ء میں لندن میں ہندوستان سے تجارت کرنے کے لئے ایک تجارتی کمپنی قائم کی گئی جس کو انگلستان کی ملکہ الزبتھ کی سرپرستی حاصل تھی۔ اسی طرح ۱۶۰۲ء میں ہالینڈ کی ایک تجارتی کمپنی کو بھی ہندوستان میں تجارت کرنے کے لئے سرکاری منظوری اور امداد حاصل ہو گئی۔

تجارتی کمپنیاں دنیا کے ہر ملک میں بنتی ہی رہتی ہیں۔ نہ اُن کو شاہی منظوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور نہ فرماں روایانِ وقت کی سرپرستی کی لیکن یہ دونوں کمپنیاں خاص طور پر شاہی سرپرستی کے بعد عالم وجود میں آئیں اس لئے کہ ان کو مالِ تجارت کے ساتھ ملکوں کی اور وہاں کے باشندوں کی بھی تجارت کرنی تھی یعنی انگلستان اور ہالینڈ میں ہندوستان کے لئے بولی بولی جا رہی تھی اور بیچارہ ہندوستان اس سودے بازی سے قطعی بے خبر تھا۔ غرضکہ ان دونوں ملکوں کے چالاک نمائندوں نے ہندوستان پہنچ کر اپنی تجارتی یا بالفاظ دیگر سیاسی سرگرمیاں شروع کر دیں۔

ہندوستان میں تین رقیب

مصریوں اور عربوں کو ہندوستان کے سمندر سے نکالنے کے بعد جس تجارتی یا ملکی اجارہ داری پر پرتگیزوں نے قبضہ جمایا تھا۔ اب اُس میں دو نئے

حصّہ دار اور پیدا ہو گئے تھے یعنی انگریز اور ولندیزی بھی اس میدان میں آن کودے تھے۔ چنانچہ پرتگیزوں کے لئے ان دو نئے رقیبوں نے ہندوستان میں شدید مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ پرتگیزوں کی حالت یہ تھی کہ وہ گوا کالی کٹ، اور چند دوسرے اہم مقامات پر قلعے بنانے کے بعد ہندوستان میں حکمرانی کے خواب دیکھ رہے تھے لیکن سنگ آمد و سخت آمد اب یہ ولندیزوں اور انگریزوں کی وجہ سے بُری طرح اُلجھن میں مبتلا ہو گئے تھے۔

پرتگیزی ہو یا کوئی دوسری یورپین قوم ہندوستان آنے کے بعد قلعے بنائے بغیر تو اُس کا کام چل ہی نہیں سکتا تھا لہٰذا پرتگیزوں کی طرح ولندیزوں نے بھی کوچن پلی کٹ، مچھلی پٹم اور دریائے ہگلی کے کنارے چنسرہ میں اپنی تجارتی کوٹھیاں یعنی قلعے بنا لئے۔ گویا انھوں نے بھی ہندوستان میں اپنی حکومت کی داغ بیل ڈال دی لیکن انگریز ان سے بھی زیادہ ہوشیار تھے۔ وہ ہر طرف پھیلتے چلے جا رہے تھے اور ان کے مقابلہ میں ولندیزی شکست خوردہ سے محسوس ہونے لگے تھے۔

۱۶۱۲ء میں انگریزوں کو شہنشاہ جہانگیر کے عہدِ حکومت میں سورت میں تجارتی کوٹھیاں یا یوں کہئے کہ قلعے بنانے کی اجازت حاصل ہو چکی تھی۔ مچھلی پٹم میں بھی انگریزوں کا کارخانہ قائم ہو گیا تھا۔ ۱۶۳۹ء میں کمپنی نے والئ چندر نگر سے کچھ زمین لے کر شہر مدراس کی بُنیاد ڈال دی تھی اور وہاں قلعہ سینٹ جارج تعمیر کر لیا تھا۔ یہ قلعہ ہندوستان کی سرزمین پر انگریزوں کی پہلی جائداد تھی۔

۱۶۵۰ء میں ڈاکٹر بارٹن کی کوششوں سے انگریز کمپنی کو بنگال میں بلا محصول تجارت کرنے اور تجارتی کوٹھیاں بنانے کی اجازت حاصل ہو گئی تھی۔ چنانچہ ہگلی اور دیگر مقامات پر انگریزوں نے تجارتی کوٹھیوں کے نام سے قلعے

بنا لئے تھے۔ اسکے علاوہ ۱۶۶۸ء میں شاہ انگلستان چارلس دوم نے بمبئی کا شہر جو اسے پرتگالی بیوی کے جہیز میں ملا تھا۔ دس پونڈ سالانہ کے برائے نام کرایہ پر کمپنی کو دیدیا تھا۔ اور اسکے ساتھ ہی کمپنی کو وہاں اپنا سکہ چلانے۔ قلعے بنانے اور جنگ کرنے یعنی ہندوستانیوں کا خون بہانے کی بھی اجازت دیدی تھی۔ غرضکہ انگریزوں نے ہندوستان میں اچھی طرح سے اپنے قدم جما لئے تھے۔

ولندیزوں نے نیا شکار تلاش کرلیا

تینوں رقیبوں کے ایک ہی میدان میں آجانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان میں آپس میں جنگ چھڑ گئی۔ ولندیزوں نے شروع شروع میں تو اپنے رقیبوں کا سختی کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن جب ان کی تجارت ہندوستان میں سرسبز نہ ہوسکی تو وہ بھی ہندوستان سے کچھ بد دل ہوگئے۔ انگریز ان پر برابر چھاتے چلے گئے۔ اور انھوں نے تقریباً ولندیزوں کو ہندوستان سے نکال دیا۔ یہاں تک کہ انگریزوں نے آگے چل کر ولندیزوں کے مرکزی مقام چنسرہ پر بھی قبضہ جما لیا۔

ولندیزی اس لئے بھی انگریزوں کے مقابلے سے ہٹ گئے تھے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے ملک گیری کے جذبے کی تسکین کے لئے ایک نیا شکار تلاش کرلیا تھا۔ یعنی انھوں نے جزائر شرق الہند (انڈونیشیا) میں جاوا کو فتح کرکے بٹویا کو اپنی سیاسی سرگرمیوں کا صدر مقام بنا لیا تھا۔ اور اس ملک پر قبضہ جمانے کے بعد ولندیزی گرم مصالحہ کی تجارت سے بے اندازہ دولت کما رہے تھے لہٰذا اس نئے شکار کے ہاتھ آنے کے بعد ان کو ہندوستان سے کچھ زیادہ دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔

انگریزوں کا پرتگیزیوں پر غلبہ

انگریزوں کو ولندیزوں کے علاوہ

اپنے دوسرے رقیب پرتگیزوں پر بھی غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ ان کو پرتگیزوں پر غلبہ حاصل کرنے میں اس لئے اور بھی آسانی ہو گئی کیونکہ پرتگیزوں نے ہندوستانیوں پر بے پناہ مظالم توڑ کر اور قزاقی کا پیشہ اختیار کر کے اپنے آپ کو ہندوستانیوں کی نظر میں اور مغلیہ حکومت کی نگاہ میں نہایت ہی ذلیل بنالیا تھا۔

پرتگیزوں کی کیفیت یہ تھی کہ یہ ہندوستانیوں کو پکڑ پکڑ کر بالجبر عیسائی بنالیتے تھے۔ اور پھر ان کو غیر ممالک میں لے جا کر بیچ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ سمندری قزاقی ان کا محبوب مشغلہ بنا ہوا تھا۔

انگریزوں کے ہندوستان آتے ہی پرتگیزوں کی انگریزوں سے جنگ چھڑ گئی پرتگیزوں کی ناشائستہ حرکات اور ظلم و ستم سے مغل حکومت کو ان سے سخت نفرت تھی جب انگریزوں نے ہندوستان آنیکے بعد پرتگیزوں کو شکست دینی شروع کی تو قدرتی طور پر مغلوں کی ہمدردیاں انگریزوں کے ساتھ ہو گئیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ انگریز اخلاقی طور پر پرتگیزوں سے بہتر تھے۔ اُن میں بھی قزاقی رشوت ستانی بدچلنی اور دُنیا بھر کے عیوب موجود تھے۔ لیکن فرق اتنا تھا کہ ایک کو عیب کرنے کا سلیقہ نہ تھا اور دوسرا سلیقہ کے ساتھ عیب کرتا تھا۔

شاہجہاں اور تقریباً تمام مغل بادشاہوں کو پرتگیزوں سے سخت نفرت تھی۔ چنانچہ جب مغل بادشاہوں نے پرتگیزوں کی طاقت کو ختم کر دیا۔ تو انگریزوں کو بنگال اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں قدرتی طور پر تجارت کرنے کے زیادہ مواقع حاصل ہو گئے۔ غرضکہ کچھ تو پرتگیزوں کی نالائقیوں کی وجہ سے اور کچھ مغل بادشاہوں کی اندھا دھند عنایتوں کی بنا پر انگریز ہندوستان کی تجارت کے واحد ٹھیکیدار بن گئے اور ان کی تجارتی یعنی سیاسی سرگرمیوں میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔

انگریزوں کی شرارتیں پرتگیزوں کے مقابلہ میں ہندوستان کی

مسلم حکومت نے انگریزوں کی جو ہمت افزائی کی تھی وہ بالکل عیاں ہے ۔ اور انگریز بھی اسے محسوس کرتے تھے ۔ لیکن اس کے باوجود انگریزوں کی "احسان شناسی" کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے عالمگیر کے عہد حکومت ہی میں مغلیہ حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازشیں شروع کردی تھیں ۔ جب اس سازش میں ان کو ناکامی ہوئی تو انھوں نے جھنجلا کر حاجیوں کے ایک ہندوستانی جہاز کو راستہ میں روک کر لُوٹ لیا ۔ برہنہ کر کے مسافروں کی تلاشی لی ۔ عورتوں کی آبرو پر حملہ کیا جس کی وجہ سے اکثر عورتوں نے اپنی عزت بچانے کے لئے سمندر میں ڈوب کر جان دیدی ۔

اورنگ زیب کو جب اس سانحہ کا علم ہوا تو اس نے یہ کہتے ہوئے کہ "سگِ زرد برادرِ شغال" پرتگیزوں کی طرح انگریزوں کو بھی ہندوستان سے نکالنے کا حکم دیدیا ۔ بس پھر کیا تھا بمبئی ۔ سورت ۔ ہگلی ۔ غرضکہ ہر جگہ انگریزوں کے خلاف پوری طاقت کے ساتھ یورش شروع ہو گئی ۔ ہگلی اور قاسم بازار کے انگریز قلعے چھوڑ چھوڑ کر یا تو بھاگ گئے یا گرفتار ہو گئے ۔ سورت اور مچھلی پٹم سے چن چن کر انھیں نکال دیا گیا ۔

انگریزوں نے جب دیکھا کہ انھوں نے اورنگ زیب جیسے مضبوط بادشاہ سے ٹکر لے کر اپنے لئے بہت بڑی مصیبت مول لے لی ہے ۔ تو وہ روئے گڑگڑائے ۔ معافیاں مانگیں ۔ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرنے کا وعدہ کیا ۔ غرضکہ کسی نہ کسی طرح انگریزوں نے معافی حاصل کرلی اور اُن کو دوبارہ ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت مل گئی یا یوں کہیئے کہ ان کو پھر ایک بار ہندوستان میں سیاسی جوڑ توڑ کرنے کے مواقع حاصل ہو گئے ۔

انگریزوں کا نیا رقیب فرانس

انگریزوں نے اپنے ایک رقیب ہالینڈ کو تو پہلے ہی ہندوستان سے

نکال دیا تھا۔ اور اس نے ہندوستان سے مایوس ہونے کے بعد اپنی تمام سرگرمیاں جزائر شرق الہند یعنی انڈونیشیا تک محدود کر دی تھیں۔ ہالینڈ کے بعد انگریزوں کا دوسرا رقیب پرتگال تھا۔ وہ بھی انگریزوں کی شاطرانہ چالوں اور مغلیہ حکومت کی دشمنی کی بنا پر تقریباً ختم ہو چکا تھا لیکن اسی دوران میں جب کہ انگریز ولندیزوں اور پرتگیزوں کو ہندوستان سے نکالنے میں مصروف تھے۔ ایک تیسرے رقیب فرانس نے۔ انگریزوں، ولندیزوں اور پرتگیزوں کی دشمنیوں سے فائدہ اُٹھا کر بڑی ہوشیار سے ہندوستان میں اپنے قدم جمالئے تھے۔

فرانس نے انگریزوں کے آنے کے چار سال بعد ہی ہندوستان کو اپنی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ اُس نے ۱۶۶۴ء میں انگریزوں اور ولندیزوں کی طرح حکومتِ فرانس کی زیرِ سرپرستی ایک تجارتی کمپنی بنالی تھی۔ چنانچہ ہندوستان آنے کے بعد فرانسیسیوں نے بھی موسلی پٹم اور سورت میں اپنی تجارتی کوٹھیاں یعنی قلعے تعمیر کرلئے تھے۔ ۱۶۶۴ء میں انھوں نے شہر پانڈیچری کی بُنیاد ڈال کر اسے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ اور بحرِ ہند میں بوربن اور موریشس کے جزیروں پر قبضہ جما کر اپنی پوزیشن خوب مضبوط کر لی تھی۔ غرضکہ فرانسیسیوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ انگریز کے مدِ مقابل کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ انگریزوں کو ولندیزوں اور پرتگیزوں سے بھی کہیں زیادہ فرانسیسیوں سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام

انگلستان کے مدبرین کو جب یہ معلوم ہوا کہ فرانس نے ہندوستان میں اپنے قدم جمالئے ہیں تو اُن کو بے حد تشویش پیدا ہوئی۔ لیکن انگریزوں کے لئے یہ دشواری

پیدا ہوگئی تھی کہ خود اُن میں آپس میں خانہ جنگی کی وبا پھیل چکی تھی۔ اس خانہ جنگی کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان سے تجارت کرنے والی کمپنی نے جب ہندوستان سے غیر معمولی فوائد حاصل کئے تو اُسکے دیکھا دیکھی لندن میں ہندوستان سے تجارت کرنے کے لئے ایک دوسری کمپنی بھی ۱۶۹۸ء میں عالم وجود میں آگئی۔ اور ان دونوں کمپنیوں میں بُری طرح سے تجارتی رقابت شروع ہوگئی۔

لندن پارلیمنٹ نے جب دیکھا کہ اس آپس کی خانہ جنگی سے ملک گیری کے اُس عیارانہ پروگرام کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے جو تجارت کے پردہ میں شروع کیا گیا تھا۔ تو پارلیمنٹ کی جانب سے ان دونوں کمپنیوں کا جھگڑا چکانے کے لئے جدوجہد شروع ہوئی۔ آخر بڑی کوشش کے بعد ۱۷۰۸ء میں ان دونوں نئی اور پرانی کمپنیوں کو متحد کردیا گیا۔ اور اس متحدہ کمپنی کا نام "ایسٹ انڈیا کمپنی" رکھا گیا۔ تاکہ یہ دونوں کمپنیاں متحد ہوکر ہندوستانیوں کی ہڈیوں پر ہندوستان میں برطانوی حکومت کی عمارت تعمیر کرسکیں

حکومتِ برطانیہ چونکہ اس کمپنی کے ذریعہ ملک گیری کی خواہش رکھتی تھی۔ اس لئے لندن پارلیمنٹ نے اس کی نگرانی کا کام خود سنبھال لیا۔ کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کرنے کی واحد اجارہ داری دیدی گئی اور اس کے ساتھ ہی صلح اور جنگ کے اختیارات بھی اس کمپنی کو حاصل ہوگئے۔ گویا اس کمپنی کو ملک گیری کے معاملہ میں برطانوی حکومت نے اپنا نمائندہ بنادیا۔

انگریزوں کو فرانس سے پریشانی

ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے بعد اگرچہ انگریزوں کی آپس کی خانہ جنگی ختم ہوگئی تھی۔ لیکن جنوبی ہند میں فرانس کا خطرہ دن بدن بڑھتا چلا جارہا تھا۔ انگریزوں کو زیادہ پریشانی اس لئے تھی کہ بمبئی۔ سورت۔ ہگلی اور قاسم بازار

کے علاوہ ان کا سب سے اہم مرکز جنوبی ہند تھا۔ جنوبی ہند میں مدراس ان کی سیاسی سرگرمیوں کا سب سے بڑا اڈا تھا۔ فورٹ سینٹ ڈیوڈ ان کا بہت بڑا مستقر تھا۔ اس کے علاوہ ناگا پٹم میں ان کے نہایت ہی مستحکم قلعے موجود تھے۔

جنوبی ہند کے یہ تمام مقامات کیونکہ علاقہ کرناٹک میں تھے۔ اس لئے ان کو نواب کرناٹک کی خوشنودئی مزاج کا بڑا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ مگر ان کو فرانس سے ہر وقت تشویش رہتی تھی کہ کہیں فرانس جنوبی ہند میں کوئی فتنہ برپا کر کے ان کے لئے نئی پریشانیاں نہ پیدا کر دے لیکن پھر بھی وہ بڑی حد تک اس لئے مطمئن تھے کیونکہ نواب کرناٹک فرانیسیوں سے بدظن تھا۔ اور انگریزوں کی طرف جھکا ہوا تھا

فرانس کی حالت یہ تھی کہ فرانس مشرقی ممالک کو لوٹنے کی تگ و دو میں اگرچہ سب کے بعد ہندوستان آیا تھا لیکن اس کے شاطر کارکنوں نے بہت جلد جنوبی ہند میں خاص اہمیت حاصل کر لی تھی۔ اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ فرانسیسیوں نے سترھویں صدی میں پانڈیچری میں ایک نوآبادی قائم کر لی تھی اور بحرِ ہند کے چند جزائر پر بھی قبضہ جما لیا تھا لیکن اٹھارھویں صدی میں ان کی طاقت اور بھی بڑھ گئی تھی کیونکہ انھوں نے چندر نگر۔ ماہی اور کاریگال پر بھی قبضہ جما لیا تھا۔ فرانسیسیوں کو سب سے زیادہ عروج گورنر ڈوما اور اس کے جانشین ڈوپلے کے زمانہ میں ہوا۔ فرانسیسیوں کو جوں جوں جنوبی ہند میں عروج حاصل ہوتا گیا۔ انگریزوں کو ان کی جانب سے تشویش بڑھتی گئی۔

ڈوپلے کا مدراس پر قبضہ

یورپ کی عیار اقوام کا مقصد چونکہ تجارت کی آڑ میں ملک گیری کرنا تھا۔ اس لئے انھوں

انھوں نے ہندوستان میں سیاسی ریشہ دوانیاں شروع کر دی تھیں۔ فرانس اس معاملہ میں سب سے زیادہ پیش پیش تھا۔ فرانسیسی گورنر ڈوپلے کی ساری سیاست کا نچوڑ یہ ہے کہ وہ ایک طرف سارے جنوبی ہند پر قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ اور دوسری جانب وہ اپنے یورپین رقیب انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ چنانچہ اسی مقصد کے لئے اُس نے پوری طرح فوجی تیاریاں کر رکھی تھیں تاکہ جوں ہی موقعہ ملے وہ ہندوستان کے علاقوں کو غصب کرنا شروع کر دے۔

ڈوپلے کی خوش قسمتی سے جب ۱۷۴۴ء میں یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ چھڑی تو ڈوپلے کو ہندوستان میں اپنی فوجی سرگرمیوں کا موقعہ ہاتھ آگیا۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی مدراس پر حملہ کر کے وہاں سے انگریزوں کو نکال دیا۔ اور اس طرح جنوبی ہند کے سب سے بڑے انگریزی مستقر "مدراس" پر فرانسیسیو کا قبضہ ہو گیا۔

ڈوپلے نے ارکاٹ بھی فتح کر لیا

نواب کرناٹک انوارالدین جو نظام دکن کا ایک ماتحت نواب تھا۔ زمانہ دراز سے فرانسیسیوں کی پیش دستیوں کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ جب فرانسیسیوں نے مدراس پر حملہ کر کے اس پر قبضہ جمایا تو کرناٹک کے نواب نے اُن کی اس حرکت پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ "چونکہ مدراس کرناٹک کے علاقہ میں ہے اور اس پر ریاست کرناٹک کا حق ہے۔ لہٰذا یہ شہر فوراً ہمارے حوالے کر دیا جائے۔"

ڈوپلے نے نواب کے اس مطالبہ کی جب کوئی پروانہ کی تو نواب نے فرانسیسیوں پر حملہ کر دیا۔ فرانسیسیوں کی فوج باوجودیکہ بہت کم تھی لیکن نواب کو شکست ہوئی۔ اور ڈوپلے نے پیش قدمی کر کے ۱۷۴۹ء میں کرناٹک کے دارالسلطنت ارکاٹ

پر قبضہ کرلیا۔

ہندوستان کی تاریخ میں ہندوستان کے خلاف یورپینوں کی یہ پہلی باقاعدہ جنگ ہے جو کرناٹک کی پہلی جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں فوجی طاقت کے ذریعہ یورپین قوم نے پہلی مرتبہ ہندوستان کے ایک علاقہ پر قبضہ جمایا۔ یوں تو یورپین اقوام عیاری اور مکاری کے ذریعہ ہندوستان کے بہت سے علاقوں پر پہلے سے قابض ہو چکی تھیں لیکن تلوار کے زور سے انھوں نے جو سب سے پہلا علاقہ ہندوستان میں فتح کیا وہ ارکاٹ تھا۔

اس فتح نے یورپینوں کے دل و دماغ پر یہ اثر کیا کہ یورپین سپاہی تعداد میں کم ہونے کے باوجود بھی ہندوستان کی بڑی سے بڑی فوج کو شکست دے سکتے ہیں یعنی اس جنگ کے بعد ہندوستان میں یورپینوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ مدراس جس سے کہ اس قضیہ کی ابتدا ہوئی تھی وہ تو ۱۷۴۸ء میں یورپ میں صلح ہونے کے بعد انگریزوں کو دوبارہ واپس مل گیا۔ لیکن ارکاٹ پر فرانسیسیوں کا غاصبانہ قبضہ بدستور باقی رہا۔

ڈوپلے کی دکن میں ریشہ دوانیاں

ارکاٹ کی فتح کے بعد فرانسیسی گورنر جنرل ڈوپلے نے سارے دکن میں ریشہ دوانیوں کا جال بچھا دیا۔ اور اُسے یہ موقعہ اس لئے ہاتھ آگیا کیونکہ ۱۷۴۸ء میں نظام الملک آصف جاہ والئ دکن کے مرنے کے بعد دکن میں ابتری پھیل گئی تھی اور نظام الملک آصفجاہ کی جانشینی کے لئے خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی۔

نظام الملک آصف جاہ کا بڑا بیٹا غازی الدین خاں تو مغلیہ دربار کے جھگڑوں میں پھنسا ہوا تھا۔ اس لئے جائز حقدار دوسرا بیٹا نواب ناصر جنگ تھا

لیکن نظام الملک مرحوم کا لاڈلا نواسہ مظفر جنگ بھی دکن کے تخت کا دعویدار تھا چنانچہ ان دونوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ فوج چونکہ ناصر جنگ کے ساتھ تھی۔ اس لئے اُسے تخت مل گیا اور مظفر جنگ ناکام ہونے کے بعد مرہٹوں کے پاس ستارہ بھاگ گیا۔ ستارہ میں ان ہی دنوں ارکاٹ کی نوابی کا ایک ناکام دعویدار سابق نواب کرناٹک کا داماد چاندا صاحب بھی مرہٹوں کے قبضہ میں تھا۔ چنانچہ مظفر جنگ اور چاندا صاحب میں دوستی ہو گئی۔

ڈوپلے جوان تمام حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کر رہا تھا اُس نے حیدر آباد اور کرناٹک کے ان دونوں ناکام دعویداروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ اسکیم بنائی کہ چاندا صاحب اور مظفر جنگ دونوں کو قابو میں لے کر پہلے تو کرناٹک کو فتح کر کے چاندا صاحب کو ارکاٹ کے تخت پر بٹھا دیا جائے اور اس کے بعد مظفر جنگ کو آگے رکھ کر حیدر آباد کو فتح کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ اس طرح سارے دکن پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہو جائے۔

کرناٹک کی دوسری جنگ

اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے چونکہ چاندا صاحب اور مظفر جنگ کو قابو میں لانا نہایت ضروری تھا۔ اس لئے ڈوپلے نے مرہٹوں کو ایک بڑی رقم دیکر پہلے تو چاندا صاحب کو مرہٹوں کی قید سے آزاد کرایا۔ اس کے بعد مظفر جنگ کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

جب شطرنج کے دونوں بڑے مہرے ڈوپلے کے قبضے میں آ گئے تو ڈوپلے نے ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ سب سے پہلے ۱۷۵۰ء میں امبر پر حملہ کیا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں نواب کرناٹک انورالدین ارکاٹ سے فرار ہونے کے بعد مقیم تھا۔ نواب نے بڑی بہادری کے ساتھ فرانسیسیوں اور چاندا صاحب کی

فوجوں کا مقابلہ کیا مگر اُسے شکست ہوگئی اور اس جنگ میں نواب مارا گیا۔ نواب کا بیٹا محمد علی بھاگ کر ترچناپلی میں پناہ گزیں ہوگیا۔ اس فتح کے بعد فرانسیسیوں نے چاندا صاحب کو ارکاٹ کے تخت پر بٹھا کر کرناٹک کا نواب بنادیا اور مظفر جنگ کو صوبہ دار دکن کا خطاب دیدیا تاکہ آگے چل کر اُس کے ذریعہ حیدرآباد پر آسانی کے ساتھ قبضہ جمایا جاسکے۔

نظامِ دکن ناصر جنگ نے جب دیکھا کہ فرانسیسیوں کی اتنی جرأت بڑھ گئی ہے کہ انھوں نے حکومت حیدرآباد کے ماتحت نواب (یعنی نواب کرناٹک) کو تلوار کے زور سے تخت سے محروم کرکے چاندا صاحب کو تخت پر بٹھادیا ہے اور اس کے بعد وہ مظفر جنگ کو آگے رکھ کر حیدرآباد کی فتح کے خواب دیکھ رہے ہیں تو ناصر جنگ نے فوراً مرہٹوں کو اور انگریزوں کو فرانسیسیوں کے مقابلے کے لئے بلالیا۔

نظام مرہٹوں اور انگریزوں کا مشترکہ لشکر فرانسیسیوں کے مقابلہ کے لئے فوراً تیار ہوگیا۔ اور اس لشکر نے پوری طاقت کے ساتھ فرانسیسی لشکر پر حملہ کردیا۔ فرانسیسیوں نے سخت مقابلہ کیا۔ مگر اُنھیں شکست ہوئی۔ مظفر جنگ گرفتار ہوگیا چاندا صاحب بھاگ گیا۔ نظام نے پیش قدمی کرکے ارکاٹ فتح کرلیا۔ اور مرحوم نواب انورالدین کے بیٹے محمد علی کو ارکاٹ کے تخت پر بٹھادیا۔ غرضکہ اس طرح ڈوپلے کی ساری بنی بنائی اسکیم خاک میں مل گئی۔

فرانسیسیوں نے پھر اقتدار حاصل کرلیا

اس شکست اور ناکامی کے باوجود بھی ڈوپلے چین سے نہیں بیٹھا۔ اُس نے چند ہی روز کے بعد ایک بڑا لشکر فراہم کرنے کے بعد جنرل بسی کی سرکردگی میں کرناٹک کے نئے نواب محمد علی کے خلاف حملہ کردیا۔

نیا نواب چونکہ ریاست کی بگڑی ہوئی حالت کو ابھی سنبھالنے بھی نہیں پایا تھا اس لئے جنرل بُسی کو اُس پر فتح حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ چنانچہ جنرل بُسی نے دوبارہ ارکاٹ پر قبضہ جمالیا۔ اور نواب مقابلہ کی تاب نہ لاکر فرار ہوگیا۔

نظامِ دکن ناصر جنگ کو جب محمد علی کی شکست کی خبر ہوئی تو وہ ایک بڑا لشکر لے کر فرانسیسوں کے مقابلے کے لئے جا پہنچا لیکن فرانسیسیوں کی سازشوں اور عیارانہ چالوں کی وجہ سے نہ صرف نظام کے لشکر میں بغاوت پھیل گئی۔ بلکہ ایک غدار نے لڑائی چھڑنے سے پہلے ہی ناصر جنگ کو قتل کردیا۔

نظامِ دکن ناصر جنگ کے قتل کے بعد فرانسیسیوں کے لئے میدان صاف تھا۔ انھوں نے فوراً اپنے پرانے پٹھو مظفر جنگ کو قید خانہ سے نکال کر حیدرآباد کے تخت پر بٹھادیا اور چاندا صاحب کو پانڈیچری سے بلاکر کرناٹک کا نواب بنادیا۔ غرضکہ پورا دکن فرانسیسیوں کے قبضہ میں آگیا۔ اور ڈوپلے کا دیرینہ خواب پورا ہوگیا۔

انگریزوں کی قابلِ رحم حالت

کرناٹک اور حیدرآباد دکن پر اب فرانسیسی اقتدار پوری طرح مسلط ہوگیا جنرل بُسی نے مع اپنے فرانسیسی فوج کے حیدرآباد میں مستقل قیام اختیار کرلیا۔ جنرل بُسی اب نواب مظفر جنگ کا مصاحب خاص تھا اور حیدرآباد کی فرانسیسی فوجوں کا کمانڈر بھی۔ غرضکہ حیدرآباد پر نظام کی نہیں بلکہ فرانسیسیوں کی حکومت تھی لیکن مظفر جنگ زیادہ مدت تک حیدرآباد کے تخت پر نہیں رہ سکا۔ کیونکہ چھ مہینے کے بعد اُسی کے بعض پُرانے ساتھیوں نے اسے قتل کردیا۔

مظفر جنگ کے قتل ہونے کے بعد بھی فرانسیسی اقتدار بدستور دکن میں قائم رہا کیونکہ جنرل بُسی نے مظفر جنگ کے قتل ہوتے ہی نظام الملک آصف جاہ کے چھوٹے بیٹے صلابت جنگ کو قید خانہ سے نکال کر تخت پر بٹھادیا تھا۔ اور اُس کی

ہمدردیاں پوری طرح حاصل کرلی تھیں۔ چنانچہ تخت پر بیٹھنے کے بعد صلابت جنگ نے شمالی سرکار کا سرسبز علاقہ فرانسیسیوں کو عطا کردیا۔

ان تمام واقعات نے جنوبی ہند میں انگریزوں کی پوزیشن بڑی نازک بنادی تھی۔ انگریز اب اپنے سب سے بڑے دشمن فرانس کے رحم وکرم پر تھے۔ وہ آنِ واحد میں انگریزوں کو مدراس، فورٹ ڈیوڈ اور جنوبی ہند سے نکال سکتا تھا چنانچہ انگریزوں کو ہر لمحہ ڈوپلے کے حملے کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ اور اُن کو اس بات کا کامل یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن ڈوپلے کے ہاتھوں جنوبی ہند کے انگریزوں کا قتلِ عام ضرور ہوگا۔

کرناٹک کی تیسری جنگ

کرناٹک کا سابق نواب محمدؐ علی فرانسیسیوں سے شکست کھانے کے بعد جنوبی کرناٹک کے شہر ترچناپلی میں چلا گیا تھا۔ چاند صاحب اور فرانسیسیوں کے لئے اس نواب کا ترچناپلی میں رہنا چونکہ خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ اس لئے چاند صاحب اور فرانسیسیوں نے ترچناپلی پر حملہ کرکے اُسے محصور کرلیا۔ محمدؐ علی کے لئے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اپنے پرانے دوستوں یعنی انگریزوں کو مدد کے لئے بُلائے۔

انگریزوں کی حالت نواب محمدؐ علی سے بھی بدتر تھی لیکن پھر بھی اُنھوں نے محض قسمت آزمائی کے لئے نواب کی مدد کے لئے انگریزی فوجیں بھیج دیں۔ انگریز کمانڈر ساندرس جب انتہائی کوشش کے باوجود ترچناپلی کے محاصرہ کو نہ توڑ سکا تو ساندرس کی فوج کے مَن چلے سپاہی رابرٹ کلایو نے ارکاٹ پر حملہ کی تجویز پیش کی تاکہ اس حملہ کے بعد چاند صاحب اور فرانسیسیوں کی فوجیں ترچناپلی اور ارکاٹ کے دو محاذوں پر تقسیم ہوجائیں۔

رابرٹ کلایو کی یہ تجویز پسند کی گئی۔ چنانچہ کلایو نے اس تجویز کے مطابق ۱۷۵۱ء میں دوسو انگریزوں اور تین سو دیسی سپاہیوں اور ایک چھوٹے سے توپ خانہ کے ذریعہ اچانک ارکاٹ پر حملہ کردیا۔ انگریزوں کا مقدر ساتھ تھا کلایو کی ہمت اور جرأت کی بدولت اس چھوٹی سی جمعیت نے ارکاٹ پر قبضہ کرلیا۔ کرناٹک کے دارالسلطنت ارکاٹ پر اس طرح اچانک قبضہ ہو جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ چاندا صاحب کا بیٹا اور فرانسیسی ارکاٹ کی جانب دوڑ پڑے۔ لیکن کلایو کے مٹھی بھر سپاہیوں نے ارکاٹ میں محصور ہو کر بڑی بہادری کے ساتھ چاندا صاحب اور فرانسیسیوں کے بہت بڑے لشکر کا ۵۳ دن تک مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ انگریزوں کی مدد کے لئے چھ ہزار مرہٹوں کی کمک آگئی۔ کچھ امداد مدراس سے بھی مل گئی۔ اور کلایو کو کامل فتح حاصل ہوگئی۔

ارکاٹ کے نکل جانے کے بعد چاندا صاحب اور اس کے فرانسیسی ساتھیوں کا دل ٹوٹ گیا۔ ادھر ترچناپلی کے محصورین میں غیر معمولی ہمت وجرات پیدا ہوگئی اس کے علاوہ محصورین کی امداد کے لئے مدراس سے مزید انگریز فوج بھی پہنچ گئی۔ چنانچہ ۱۱ رجون ۱۷۵۲ء کو ترچناپلی بھی انگریزوں نے فتح کرلیا۔ دو دن کے بعد چاندا صاحب کو قتل کردیا گیا اور سارا کرناٹک انگریزوں کے دوست نواب محمد علی کے قبضہ میں آگیا۔

کرناٹک کی اس تیسری جنگ میں ڈوپلے کو سب سے زیادہ جس چیز سے تکلیف پہنچی وہ یہ تھی کہ نظام دکن صلابت جنگ فرانسیسیوں کا پرانا دوست ہونیکے باوجود غیر جانبدار رہا بیٹھا رہا حالانکہ فرانسیسیوں کو یہ امید تھی کہ وہ اس نازک وقت میں چاندا صاحب اور فرانسیسیوں کی ضرور مدد کریگا نواب نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ ڈوپلے کے زور دینے پر ڈوپلے کو کرناٹک کا نواب تسلیم کرلیا لیکن ایسی حالت میں جبکہ کرناٹک پر نواب محمد علی اور اُسکے دوست انگریزوں کا قبضہ تھا تو ڈوپلے کے لئے یہ نام کی نوابی قطعی بے معنی تھی۔

دوسرا باب

ہندوستان میں
انگریزوں کے اقتدار کی ابتدا

۱۷۵۲ء تا ۱۷۶۶ء

انگریزوں کے اقتدار کی ابتدا

کرناٹک کی تیسری جنگ میں انگریزوں کی کامیابی ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کی ابتدا ہے۔ ۱۷۵۲ء کی اس جنگ میں فرانسیسیوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد انگریزوں کے قدم ہندوستان میں جم گئے۔ اور انگریزوں نے نواب کرناٹک محمد علی کو کٹ پتلی بنا کر اپنا اُلو سیدھا کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ محمد علی تو نام کا نواب رہ گیا۔ لیکن انگریز حقیقی معنوں میں کرناٹک کے نواب بن گئے۔

کرناٹک کی اس تیسری جنگ کے بعد فرانسیسیوں کی ایسی ہی نازک حالت ہو گئی جیسی کہ ایک سال قبل انگریزوں کی تھی۔ فرانسیسیوں کا سب سے بڑا مستقر پانڈیچری انگریزوں کے رحم و کرم پر تھا۔ فرانسیسیوں کو اس وجہ سے اور بھی نقصان پہنچا کیونکہ حکومتِ فرانس نے ڈوپلے سے ناراض ہو کر اس جیسے شاطر کو ہندوستان سے واپس بلا لیا تھا۔ صرف یہی نہیں ہوا۔ بلکہ ڈوپلے جس نے کہ ہندوستان کو فرانسیسی مقبوضہ بنانے کے لیئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ جب فرانس پہنچا تو اُسے خوب ذلیل کیا گیا اور اُسے گمنامی کے گڑھے میں دھکیل دیا گیا۔

فرانسیسی طاقت کا خاتمہ

ڈوپلے کے چلے جانے کے بعد ہندوستان کے انگریزوں اور فرانسیسیوں میں صلح ہو گئی تھی لیکن ۱۷۵۶ء میں جب انگلستان اور فرانس میں پھر جنگ چھڑ گئی تو حکومتِ فرانس نے مشہور فرانسیسی جنرل کاؤنٹ لالی کو انگریزوں کے

مقابلہ کے لئے ہندوستان بھیج دیا۔

ڈوپلے کی بے عزتی کی وجہ سے ہندوستان میں رہنے والے تمام فرانسیسی افسر چونکہ حکومتِ فرانس سے بددل ہو چکے تھے اس لئے انھوں نے حکومتِ فرانس کے نمائندے کاؤنٹ لالی کو کوئی مدد نہیں دی لیکن پھر بھی کاؤنٹ لالی نے انگریزی علاقوں پر حملہ کر کے سینٹ ڈیوڈ کا قلعہ فتح کر لیا۔ اس کے بعد کاؤنٹ لالی نے انگریزوں کے سب سے بڑے مستقر مدراس پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس حملہ میں اُسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ فرانسیسیوں کو جان بچا کر پانڈیچری کی طرف بھاگنا پڑا۔

دوسرے سال یعنی ۱۷۵۷ء میں جب انگریز افسر جنرل سر آئیر کوٹ انگلستان سے نئی فوج لے کر ہندوستان پہنچا تو فرانسیسیوں اور انگریزوں میں فیصلہ کُن جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں فرانسیسیوں کو بُری طرح شکست ہوئی انھوں نے تقریباً اپنے تمام مقبوضات کھو دئے۔ یہاں تک کہ ۱۷۶۱ء میں انگریزوں نے پانڈیچری بھی فتح کر لیا۔

فرانسیسی کمانڈر جنرل بُسی اس سے قبل ہی انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہو چکا تھا۔ اب لالی نے بھی ہتھیار ڈال کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ اور اس طرح ہندوستان سے فرانسیسی اقتدار کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

جنوبی ہند پر انگریزوں کا قبضہ

انگریزوں کے سب سے بڑے رقیب فرانس کے میدان سے ہٹتے ہی انگریزوں کو جنوبی ہند میں کامل اقتدار حاصل ہو گیا۔ زمانہ کا انقلاب دیکھئے کہ وہی انگریز جو ۱۷۵۱ء میں دشمنوں کے رحم و کرم پر زندگی کے آخری

سانس گن رہے تھے۔ دو سال کے اندر اندر وہ جنوبی ہند کی ایک بڑی طاقت شمار ہونے لگے۔ چڑھتے ہوئے سورج کو سب ہی پوجتے ہیں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے متاثر ہو کر نظام دکن جو پہلے فرانسیسیوں کا دوست تھا انگریزوں کا بہی خواہ اور یار وفادار بن گیا۔

مندرجہ بالا تاریخی واقعات صاف طور پر بتا رہے ہیں کہ ہندوستان کا دشمن نمبر ۱ اور ہندوستان میں انگریزی حکومت کا معمار اول وہ جنرل کلایو ہے جس نے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی بنیاد کرناٹک میں رکھی اور نواب کرناٹک کو احمق بنانے کے بعد یہ اپنا اُلو سیدھا کرتا رہا۔

کلایو ابتدا میں نہ کوئی فوجی افسر تھا۔ نہ سپاہی بلکہ یہ اٹھارہ برس کی عمر میں بطور کلرک ہندوستان آیا تھا۔ اور زمانہ دراز سے ہندوستان ہی میں مقیم تھا لیکن رفتہ رفتہ کلایو جنگی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگا اور چند ہی سال میں وہ ایک شاطر فوجی افسر بن گیا لیکن اس کی جنگی قابلیت کا اندازہ دنیا کو اُس وقت ہوا جب اس نے مٹھی بھر سپاہیوں کے ذریعہ کرناٹک کے دار السلطنت ارکاٹ پر حملہ کر کے سارا نقشہ جنگ ہی بدل ڈالا۔

یہ حقیقت ہے کہ کلایو کا ارکاٹ پر حملہ ہندوستان کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ ہے، کوئی تعجب نہیں کہ اگر کلایو نے یہ جسارت نہ کی ہوتی تو شاید ہندوستان کی تاریخ میں انگریزوں کا نام بھی نہ دکھائی دیتا۔

کلایو نے کرناٹک کی جس ریاست پر قبضہ جمایا تھا وہ کوئی چھوٹی سی ریاست نہیں تھی بلکہ وہ جنوبی ہند میں راس کماری سے لے کر اڑیسہ تک تقریباً دو ہزار مربع میل میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کرناٹک کو جنوبی ہند میں اہم ترین جغرافیائی حیثیت بھی حاصل تھی۔ گویا انگریز اپنے پہلے ہی حملہ میں ہندوستان

کے ایک ایسے خطہ پر قابض ہو گئے تھے جہاں سے وہ رفتہ رفتہ سارے ہندوستان میں پھیل سکتے تھے۔

کرناٹک کی وسیع ریاست کے علاوہ انگریزوں نے بنگال کے اہم ترین مقام کلکتہ اور قاسم بازار میں پہلے ہی فوجی اڈے قائم کر رکھے تھے اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے مغربی ساحل پر بمبئی اور سورت جیسے اہم مقامات پر بھی یہ قابض تھے۔ غرضکہ ہندوستان میں جبکہ شاہ عالم ثانی جیسے کمزور مغل بادشاہ کا دور تھا اور ہندوستان چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں بٹ چکا تھا۔ انگریزوں کے ہاتھ کرناٹک جیسے اہم خطہ کا آجانا بہت بڑی نعمت تھی۔

انگریز جیسی عیار قوم کے ہاتھ کرناٹک جیسے کلیدی مقام کا آجانا تھا کہ انھوں نے فوراً اپنے دیرینہ خواب کو پورا کرنے کے لئے جوڑ توڑ شروع کر دیا۔ انھوں نے اس خطہ سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ یہ کرناٹک کے بعد بنگال اور بہار کی جانب بڑھے اس کے بعد انھوں نے اودھ پر پورا تسلط قائم کیا اور شاہ عالم ثانی ہی کے دورِ حکومت میں یہ ہندوستانیوں کی نالائقی کی بنا پر سارے ہندوستان کے مالک و مختار بن گئے۔ کرناٹک کی فتح کے بعد انھوں نے کس طرح بنگال میں جوڑ توڑ کر کے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کئے۔ اس کا اندازہ ان واقعات سے ہو گا جو ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

بنگال و بہار پر انگریزوں کی نظرِ عنایت

بنگال سلطنت مغلیہ کا خوشحال ترین صوبہ تھا۔ جہاں دولت کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ اس صوبہ کا ایک معمولی زمیندار بھی شاہ انگلستان سے ہزار درجہ خوشحال تھا۔ بنگال کی دولت نے کمپنی کے اُن انگریزوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ جو انگلستان جیسے بنجر غریب اور ماہی گیروں

کے ملک سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ انگریز کا انتہائے مقصود یہ تھا کہ اگر بنگال کا ایک ٹکڑا بھی ہاتھ آ جائے تو انگریز قوم کی قسمت بدل جائے۔ چنانچہ اسی ناپاک مقصد کے ماتحت انگریز زمانۂ دراز سے تاجر کا بھیس بدلے ہوئے کلکتہ اور قاسم بازار میں عیاری کی دوکان لگائے بیٹھا ہوا تھا اور موقعہ کی تاک میں تھا۔

علی وردی خاں جو کسی زمانہ میں بنگال بہار اُڑیسہ کا مغلوں کی جانب سے گورنر تھا۔ وہ مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد اس تمام علاقہ کا خود مختار فرمانروا بن چکا تھا۔ یہ گرگ باراں دیدہ انگریزوں کی بدلی ہوئی نگاہوں سے اُن کے ناپاک ارادوں کو بھانپ چکا تھا۔ چنانچہ اس نے مرنے سے قبل اپنے جانشین نواسے نواب سراج الدولہ کو وصیت کی تھی کہ

"مغربی قوموں کی اس طاقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا جو انھیں ہندوستان میں حاصل ہو چکی ہے۔ اگر میری عمر کا پیمانہ لبریز نہ ہو چکا ہوتا تو اس خطرہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتا۔ اب اس کام کی تکمیل تمہارے ذمہ ہے۔ میرے چراغ دکن میں ان کی سیاسی سرگرمیوں سے سبق حاصل کرو۔ ذاتی جنگوں میں اُلجھا کر انھوں نے مغل اعظم کی رعایا کے اموال اور املاک پر قبضہ جما لیا ہے ایک ہی وقت میں کئی طاقتوں کو تباہ کرنے کی کوشش نہ کرنا سب سے پہلے انگریزوں کی طاقت توڑنا بیٹو بیٹا انھیں سپاہی رکھنے اور قلعے تعمیر کرنے کی اجازت نہ دینا۔ اگر ایسا ہوا تو بنگال تمہارا نہیں"

اس وصیت کے بعد ۱۷۵۶ء میں علی وردی خاں مرگیا۔ اور اُس کی موت کے

بعد جب نواب سراج الدولہ بنگال وبہار اور اڑیسہ کے تخت پر بیٹھا تو اُس نے اس بات کو بُری طرح محسوس کیا کہ انگلستان کے عیار ماہی گیر نواب محمد علی کے پردے میں کرناٹک کے نواب بن چکے ہیں۔ اور انھوں نے سارے دکن پر اقتدار حاصل کرلیا ہے۔ سراج الدولہ کو کلکتہ اور قاسم بازار کے قلعوں سے یہ آوازیں آنے لگیں کہ "اب تمہاری باری ہے"

انگریز جیسی عیار قوم سراج الدولہ کی طرف سے غافل نہ تھی۔ چنانچہ کرناٹک کی فتح کے بعد ہی انگریزوں نے سراج الدولہ کے خلاف سازش کا جال بچھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی ضرورت انگریزوں کو اس لئے اور بھی تھی۔ کیونکہ سراج الدولہ کرناٹک کا نواب محمد علی نہیں تھا۔ بلکہ ایک ایسا محبِ وطن حکمران تھا جو انگریزوں کی صورت تک دیکھنے کا روادار نہ تھا۔

انگریزوں نے اس کے تخت نشین ہوتے ہی اس کے خلاف جوڑ توڑ شروع کر دیا۔ اُس کے ارکانِ حکومت کو سازش میں شریک کیا۔ اُس کے دشمنوں کو اپنے پاس کلکتہ میں پناہ دی۔ چنانچہ ڈھاکہ کے دیوان کا بیٹا کرشن داس جس نے کہ سراج الدولہ کی تخت نشینی کے معاملہ میں اُس کے دشمنوں سے ساز باز کر رکھی تھی۔ جب بھاگ کر انگریزوں کے پاس پہنچا اور سراج الدولہ نے اسے واپس دینے کا مطالبہ کیا تو انگریزوں نے صاف انکار کر دیا۔

سراج الدولہ کا انگریزوں پر حملہ

سراج الدولہ نے جب دیکھا کہ کلکتہ اور قاسم بازار کے قلعے اُس کی اجازت کے بغیر مستحکم کئے جا رہے ہیں۔ ان قلعوں کی محفوظ چہار دیواریوں میں بیٹھا ہوا کلایو سراج الدولہ کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے اور سراج الدولہ کے مخالفوں اور دشمنوں کو بے فکری

کے ساتھ پناہ دی جا رہی ہے۔ تو سراج الدولہ کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ ان عیار تاجروں کے گڑھ پر حملہ کر دے۔

۱۷ ؍ جون ۱۷۵۶ء کو سراج الدولہ نے قاسم بازار کی فیکٹری پر حملہ کر دیا فیکٹری سراج الدولہ کے حملہ کی تاب نہ لا سکی۔ انگریز سپاہی بہت کم تھے۔ فیکٹری پر سراج الدولہ کے سپاہیوں کا قبضہ ہو گیا۔ سراج الدولہ کو اگرچہ انگریزوں سے شدید نفرت تھی لیکن پھر بھی اس نے مٹھی بھر انگریزوں کی جان لینا بزدلی خیال کیا۔ اس کے بعد سراج الدولہ کلکتہ کی جانب متوجہ ہوا۔ پانچ سو انگریزوں اور ڈیڑھ ہزار دیسی سپاہیوں نے قلعہ بند ہو کر سراج الدولہ کے لشکر کا مقابلہ کیا۔ لیکن مقابلہ کی تاب نہ لا کر کمپنی کے ڈائرکٹر اور انگریز جہازوں میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ غرضکہ ۲۰ ؍ جون ۱۷۵۶ء کو کلکتہ پر بھی سراج الدولہ کا قبضہ ہو گیا۔

سراج الدولہ نے فتح تو حاصل کر لی لیکن انگریزوں سے جنگ کے دوران میں اُس کے ساتھ طرح طرح سے غداریاں کی گئیں۔ سراج الدولہ کے فرانسیسی اور پرتگیزی توپچیوں نے انگریزوں کے دشمن ہونے کے باوجود محض سفید رنگ کا پاس کرتے ہوئے عین وقت پر غداری کی۔ کلکتہ کی فتح کے بعد جب سراج الدولہ نے اُسے میر جعفر اور مانک چند کی حفاظت میں دیا تو ان غداروں نے دوبارہ کلکتہ پر انگریز کا قبضہ کرا دیا۔

سراج الدولہ کب خاموش بیٹھنے والا تھا۔ اُس نے دوبارہ انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس مرتبہ ایک تیسرا ہندوستانی غدار سیٹھ امی چند (سکھ سوداگر) صلح اور آشتی کا دیوتا بن کر میدان میں کود پڑا۔ اور اس نے سراج الدولہ کی مروت سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے انگریزوں کو معافی دلوا دی۔ جس کے بعد سراج الدولہ۔ راجہ مانک چند کو کلکتہ کے قلعوں کا حاکم اعلیٰ مقرر کر کے

مرشد آباد چلا گیا۔

سراج الدولہ کے خلاف کلایو کی سازش

سراج الدولہ سے معافی حاصل کرنے کے بعد چونکہ انگریز اور فرانسیسیوں میں جنگ چھڑ گئی تھی۔ اس لئے انگریز اُدھر مصروف ہو گئے۔ لیکن جُوں ہی اُن کو فرانسیسیوں کو کامل شکست دینے کے بعد فرصت ملی تو انھوں نے حب الوطنی کے جرم کی بنا پر سراج الدولہ کا محضر قتل تیار کرنا شروع کر دیا۔

انگریزوں نے سیٹھ اَمی چند کے ذریعہ سراج الدولہ کے سپہ سالار میر جعفر کو نوابی کا لالچ دیا۔ غدار میر جعفر تیار ہو گیا۔ اور وعدہ کیا کہ میں پونے دو کروڑ روپیہ نقد دوں گا اور نواب ہونے کے بعد میرے علاقہ میں ہر قسم کی مراعات انگریزوں کو حاصل ہوں گی۔ میر جعفر کو غداری پر آمادہ کرنے کے بعد یہ طے کیا گیا کہ پہلے کلکتہ پر حملہ کیا جائے۔ اور اس کے بعد سراج الدولہ کو میر جعفر کے ذریعہ ختم کرا دیا جائے۔ غرضکہ سراج الدولہ کے محضر قتل پر دستخط کر دئے گئے۔

عیار کلایو نے سُوچے ہوئے پروگرام کے مطابق ۲۹ دسمبر ۱۷۵۶ء کو ڈم ڈم کے قلعہ پر حملہ کر دیا۔ راجہ مانک چند جسے پہلے ہی توڑ لیا گیا تھا۔ آدھ گھنٹہ میں مقابلے سے فرار ہو گیا۔ اس کے بعد کلایو نے کلکتہ فتح کر لیا ہگلی میں نواب کی عسکری قوّت نہ ہونے کی برابر تھی اور ہوتی کہاں سے جب کہ نیچے سے لے کر اوپر تک سب انگریزوں سے ملے ہوئے تھے اور نواب کو اس سازش کا پتہ تک نہ تھا۔ چنانچہ ہگلی کے قلعے بھی فتح ہو گئے۔

انگریزوں نے دیسی رعایا کا بڑی بے دردی سے خون بہایا سراج الدولہ نے جب غصہ کے عالم میں کلکتہ آ کر انگریزوں کی تادیب کرنی چاہی تو پھر

ہندوستانی غدارانِ وطن یعنی کلایو کے ایجنٹ صلح کے دیوتا بن کر بیچ میں کود پڑے اور برائے نام صلح ہوگئی کیونکہ یہ صلح اس وقت تک کے لئے کی گئی تھی جب تک کہ سازش کا آخری حملہ سراج الدولہ پر نہیں ہو جاتا۔

محبِّ وطن سراج الدولہ کا قتل

چند روز کی نام نہاد صلح کے بعد انگریزی فوجیں جون ۱۷۵۷ء میں مرشد آباد کی جانب بڑھتی ہوئی دکھائی دیں۔ سازش سے بے خبر سراج الدولہ اپنے غدار سپہ سالار میر جعفر کو ساتھ لے کر آگے بڑھا۔ پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ اور انگریزوں کے لشکر کا مقابلہ ہوا لیکن سراج الدولہ کو یہ خبر نہ تھی کہ اُس کے سپہ سالار میر جعفر نے پہلے ہی انگریزوں سے نوابی کا سودا کر لیا ہے۔

پلاسی کے میدان میں آنے کے بعد جب میر جعفر اور دوسرے فوجی سرداروں نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تو سراج الدولہ سب کچھ سمجھ گیا۔ اُس نے مٹھی بھر سپاہیوں کو ساتھ لے کر مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن اُسے فرار ہونا پڑا۔ وہ مرشد آباد آیا جہاں اسے گرفتار کر کے انگریزوں نے قتل کر دیا یعنی ہندوستان کے سب سے بڑے محبِّ وطن کا نہیں بلکہ سارے وطن کا غداروں نے خون کرا دیا۔ یہ ہندوستان کی غلامی کے کاغذ پر دکن کے بعد دوسری خونیں مہر تھی۔

پلاسی کی جنگ کے بعد انگلستان مالا مال

پلاسی کی جنگ کے بعد جب مرشد آباد کے نوابی خزانہ کا جائزہ لیا گیا تو اُس میں سے کوئی بڑی دولت نہ مل سکی لیکن پھر بھی پلاسی کی جنگ کی برکت سے نامعلوم طریقہ پر انگلستان یکایک مالا مال ہو گیا ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی سازش کے ذریعہ خزانہ پر بھی پہلے ہی سے انگلستان کے ماہرینِ تجارت نے ہاتھ صاف کر دیا ہو اور غالب خیال یہی ہے کہ ایسا ہی ہوا۔

کیونکہ انگلستان جو پلاسی کی جنگ سے قبل ایک غریب ملک تھا جہاں چند مہاجنوں کے سوا کوئی ممتاز بینک نہ تھا۔ اس جنگ کے بعد وہاں درجنوں بینک کھل گئے۔ لندن میں عام خوشحالی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ کلایو اور اُس کے رفقائے کار کی دولت مندی کا یہ عالم تھا کہ ان پر خاندانی نواب ہونے کا دھوکہ ہوتا تھا۔ غرضکہ پلاسی کی جنگ نے ہندوستان کی گردن میں تو انگریز کی غلامی کا طوق ڈال دیا۔ اور ماہی گیروں کی انگریز قوم کو اس نے مالامال کر دیا۔

غدّار وطن میر جعفر بنگال کا نواب

شہید وطن سراج الدولہ کے بعد جب ۱۷۵۷ء میں میر جعفر تخت پر بیٹھا تو اُسے پتہ چلا کہ اُس نے ملک اور وطن کے ساتھ غداری کر کے خود اپنے لئے کتنی بڑی مصیبت مول لی ہے۔ میر جعفر نام کا نواب تھا۔ حقیقی اختیارات کلایو کے ہاتھ میں تھے۔ جس کو عیارانہ خدمات کے صلہ میں حکومتِ برطانیہ نے گورنر بنگال بنا دیا تھا۔

میر جعفر کو جب نوابی ملی تو خزانہ اُس کی توقع کے خلاف تقریباً خالی تھا اور کلایو کا مطالبہ تھا کہ حسب وعدہ پونے دو کروڑ روپیہ نذر دو اس کے علاوہ کروڑوں روپیہ تاوان جنگ کا ادا کرو۔ میر جعفر کو جو کچھ ملا وہ سب سمیٹ سماٹ کر آقایانِ ولی نعمت کو دیدیا۔ یہاں تک کہ کشتیوں میں بھر بھر کر عورتوں کے زیورات اور جواہرات بھی کلایو کی خدمت میں پیش کر دئے گئے۔

کلایو کو بیس لاکھ روپیہ کی رشوت اور کمپنی کے ڈائرکٹروں کے لئے لاکھوں روپے کے نذرانے اس کے علاوہ تھے۔ غرضکہ سارا سرمایہ لٹا دینے کے باوجود بھی میر جعفر انگریزوں کا قرضہ ادا نہ کر سکا۔ آخر اُس نے وعدہ کیا کہ بقیہ روپیہ تین سال کے اندر ادا کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ میر جعفر کو آقایان

ولی نعمت کی خوشنودی کے لئے چوبیس پرگنہ کا علاقہ بھی انگریزوں کی نذر کردینا پڑا۔

فرانسیسی قوت تو ختم ہو چکی تھی لیکن ولندیزوں میں ابھی تک تھوڑی بہت زندگی کے آثار موجود تھے۔ وہ انگریزوں کا یہ عروج نہ دیکھ سکے۔ چنانچہ ولندیزوں کے ایک جنگی بیڑے نے ۱۷۵۹ء میں ہگلی پر حملہ کر دیا۔ کلایو نے ولندیزوں کو کمپنی اور میر جعفر کی مشترکہ فوجوں سے شکست دیدی۔ غرضکہ ولندیزوں کی طاقت کا چراغ بھی ٹمٹمانے کے بعد انگریزوں کے سامنے گل ہوگیا۔ اب بنگال میں کوئی یورپین طاقت انگریزوں کی مدمقابل نہ تھی۔

مغل بادشاہ کا بیٹا شہزادہ عالی گوہر جو مغل امرائے سلطنت کی سازشوں سے گھبرا کر چلا آیا تھا اُس نے نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ کی امداد سے بہار پر حملہ کر دیا۔ شہزادہ کی فوج نے پٹنہ کا محاصرہ کر لیا۔ غدار میر جعفر نے کلایو کو مدد کے لئے بلایا۔ کلایو فوراً جا پہنچا۔ مغل شہزادہ کو شکست ہوگئی۔ کلایو نے موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بہت بڑی جاگیر پر ہاتھ رکھ دیا۔ جو میر جعفر کو دینی پڑتی۔

مُحبِّ وطن شہزادہ میرن کا قتل

کلایو جس کے پاس بے اندازہ دولت جمع ہو چکی تھی وہ اس دولت کو ٹھکانے لگانے اور اس کا مظاہرہ کرنے کے لئے ۱۷۶۰ء میں گورنر کے عہدہ سے مستعفی ہو کر ۸ فروری کو عازم انگلستان ہوگیا۔

جولائی ۱۷۶۰ء کو وین سٹارٹ کلایو کی جگہ بنگال کے انگریزی مقبوضات کا گورنر مقرر ہوا تو اُس نے میر جعفر کے بیٹے میرن کو "شاہ عالم" بادشاہ کے خلاف صف آرا کرنا چاہا کیونکہ شاہ عالم سابق شہزادہ عالی گوہر نے دوبارہ بہار پر حملہ کر دیا تھا۔

محبِ وطن میرن نے مغل بادشاہ کے مقابلہ میں صف آرا ہونا قومی غیرت کے خلاف سمجھا اور اس نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ انگریزوں نے میرن کی امداد کے بغیر بادشاہ کو شکست دیدی۔ مگر وہ میرن کی طرف سے چوکنے ہو گئے۔ میرن ایک محبِ وطن نوجوان تھا۔ جو میر جعفر جیسے غدار وطن کے گھر میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی حُبّ الوطنی انگریز کے نزدیک ناقابلِ معافی جرم تھا چنانچہ چند روز کے اندر میرن قتل کر دیا گیا۔ یا انگریزوں کی سیاست پر بھینٹ چڑھ گیا۔ صرف اس جرم میں کیونکہ اس میں قومی اور اسلامی غیرت موجود تھی۔

انگریز میر جعفر سے بھی بیزار

میر جعفر سے انگریزوں کو جو کچھ بھی لینا تھا وہ لے چکے تھے۔ تین سال کی مدت میں انھوں نے بنگال کو مفلس بنا کر زروجواہر کے انبار اکٹھے کر لئے تھے۔ اور بنگال کے روپیہ سے انگلستان کو رشکِ جناں بنا دیا تھا۔ اب ان کو میر جعفر کی بجائے کسی دوسرے احمق کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انگریزوں کی نظرِ انتخاب غدار میر جعفر کے داماد میر قاسم پر پڑی۔ غرضکہ میر جعفر کو وجہ بتائے بغیر معزول کر دیا گیا۔ مگر اُس وقت جب اس غدارِ وطن کی بدولت ہندوستان کی گردن میں انگریز کی غلامی کا طوق پڑ چکا تھا۔

نواب میر قاسم کی تخت نشینی

۱۷۶۰ء میں انگلستان کے بازیگروں نے میر جعفر کو معزول کر کے اُس کے داماد نواب میر قاسم کو بنگال و بہار اور اُڑیسہ کے تخت پر بٹھا دیا۔ نئے نواب نے انگریزوں کو بے اندازہ زروجواہر عطا کئے۔ اس کے علاوہ بردوان۔ مدناپور اور چاٹگام کے زرخیز اضلاع بھی انگریزوں کے حوالے کر دئے۔ انگریزوں نے وعدہ کیا کہ وہ میر قاسم کو ہر قسم کی فوجی امداد دیں گے۔ میر قاسم کی اس قدر داد دہش کے

بعد بھی اُس کے سفید آقا اس سے مطمئن نہ تھے۔ کیونکہ کمپنی کے ڈائرکٹروں کی حرص آز اس بات کی مقتضی تھی کہ میر قاسم بنگال کے غریبوں کا خون چوس چوس کر نہ صرف کمپنی کی بلکہ خود اُن کی تجوریوں کو بھی بھرتا رہے۔

میر قاسم سے جہاں تک ہو سکا اُن کی خواہش پر عمل کیا۔ اُس نے رعایا پر ظلم بھی کئے۔ ستم بھی کئے مگر سفید آقاؤں کا گھر برابر بھرتا رہا۔ یہاں تک کہ میر قاسم نے بیگمات کے زیورات اور جواہرات تک بیچ کر انگلستان کے تاجروں کو خوش کرنا چاہا۔ مگر ہوس کی کھوپری کو کون بھر سکتا ہے۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں اور میر قاسم میں اَن بَن رہنے لگی اور کمپنی کے ڈائرکٹر میر قاسم کو معزول کرنے کے لئے بہانہ تلاش کرنے لگے۔

میر قاسم سے بھی انگریز خفا

انگریز بنگال میں ہندوستانی تجارت کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ اس سے مطمئن نہ تھے کہ ہندوستانیوں کے مال پر تو زیادہ محصول لیا جاتا ہے۔ اور انگریزوں کو برائے نام محصول صرف نو فی صدی دینا ہوتا ہے۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ نو فی صدی بھی ادا نہ کریں۔ حالانکہ معاہدہ کی رُو سے وہ اس محصول کے ادا کرنے کے پابند تھے۔ لیکن انھوں نے معاہدہ کی پابندیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سرکاری محصول ادا کئے بغیر تاجرانہ لوٹ شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو گرانقدر محصول ادا کرنے والے ہندوستانی تاجر تباہ ہو گئے۔ اور دوسری جانب نواب کا خزانہ بھی خالی ہو گیا۔ کیونکہ وہ رقم جو شاہی خزانہ میں جانی چاہئے تھی انگریزوں کے حلق سے اُترنے لگی۔

نواب نے جل کر ہندوستانی اور انگریز دونوں تاجروں کے مال پر سے محصول اُڑا دیا یعنی کالے ہندوستانیوں کو انگلستان کے سفید فام لوگوں کی برابر

لاکر کھڑا کر دیا۔ انگریز بھلا اسے کب برداشت کر سکتا تھا۔ اُس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ختم ہو گیا۔ انگریزوں نے مدت سے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ وہ دیسی تاجروں سے رشوت لے کر اُن کا مال اپنے نام سے منگاتے رہتے تھے یعنی وہ انگریز اور ہندوستانی تاجر کے محصول کے بین فرق سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے خوب دولت کما رہے تھے۔ جب یہ ناجائز آمدنی بند ہو گئی تو انگریز میر قاسم کا دشمن بن گیا۔ اور اُس نے میر قاسم کے خلاف فوج کشی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

میر قاسم اور انگریزوں میں جنگ

میر قاسم نے ہر چند چاہا کہ جنگ نہ ہو۔ لیکن سفید آقا تو خونریزی کے لئے تُلے ہوئے تھے۔ انھوں نے جنگ سے دستکش ہونے کے لئے میر قاسم کے سامنے ایسی ذلّت آمیز اور تباہ کُن شرائط رکھیں جنکو کوئی بھی خوددار شخص گوارا نہیں کر سکتا۔ الغرض ۱۷۶۲ء میں میر قاسم پر حملہ کر دیا گیا۔ نواب نے انگریز فوج کو شکست دیدی۔ انگریز کمانڈر اور بہت سے انگریزوں کو گرفتار کر کے مونگیر بھیجدیا۔

انگریزوں نے میجر ایڈمز کی سرکردگی میں دوبارہ نواب کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ اور وہی پُرانا جنگی پینترا اختیار کیا۔ جو وہ سراج الدولہ کے مقابلہ پر اختیار کر چکے تھے۔ یعنی نواب کے آدمیوں کو سازش کر کے اپنے ساتھ ملا لیا یہ بُزدلانہ طریقہ کار انگریزوں کا پُرانا نسخہ ہے جو ہمیشہ ہی تیر بہدف ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ نواب کا لائق جرنیل تقی خاں اُس وقت بے دست و پا ہو کر رہ گیا جبکہ عین میدانِ جنگ میں نواب کی فوجوں نے انگریزی طلسم کی بدولت غدّاری اور نمک حرامی کا ثبوت دیا۔

نواب اس سازش کے باوجود بھی نہ گھبرایا۔ اس نے اودانالا کے اہم ترین مقام پر انگریزوں کے مقابلہ کی پوری تیاری کر لی۔ انگریز میر قاسم کے مقابلہ پر آتے ہوئے شروع میں تو گھبراتے تھے۔ لیکن جب یہاں بھی اُن کی سازش کا جادو چل گیا تو نواب کی فوجی طاقت کو انگریزوں کی مکاری نے شکست دیدی، اودانالا انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔ میر قاسم بھاگ کر مونگیر پہنچا۔ اور مونگیر پہنچنے کے بعد اُس نے سب سے پہلے اپنے باغی افسر گرجین خاں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ اس کے علاوہ تمام انگریز قیدیوں کو بھی ٹھکانے لگادیا۔ اُن کے قتل کا فریضہ فرانسیسی افسر سمرو نے انجام دیا۔ ادھر انگریزوں نے غدار ازلی میر جعفر کو دوبارہ تخت پر بٹھادیا۔

میر قاسم اور نواب اودھ کا انگریزوں پر حملہ

مونگیر سے فرار ہونے کے بعد

میر قاسم ۳ر دسمبر ۱۷۶۳ء کو اودھ پہنچا۔ مغلیہ حکومت کا نام نہاد بادشاہ شاہ عالم بھی اس زمانہ میں الہ آباد ہی میں تھا۔ بادشاہ اور نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ دونوں نے میر قاسم کی مدد کا فیصلہ کرلیا۔ شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ نے کلکتہ کونسل کو انگریزوں کی غلط روش کے بارے میں بادشاہ کی جانب سے ناراضگی کا خط لکھا۔ لیکن انگریزوں نے جب اس بے حقیقت کاغذ کے پُرزے کا جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تو نواب وزیر اودھ کی فوجیں میر قاسم کی حمایت میں پٹنہ کی جانب روانہ ہوگئیں۔

مغل بادشاہ اگرچہ ختم ہوچکا تھا لیکن اب بھی اُس کا نام بڑا تھا جب انگریزوں کو معلوم ہوا کہ بادشاہ اور نواب اودھ کی جانب سے میر قاسم کی حمایت میں فوجیں پٹنہ کی طرف بڑھ رہی ہیں تو انگریز پھر سازش کے پُرانے منتر کو کام میں

لایا۔ چنانچہ لڑائی سے قبل ہی نواب وزیرِ اودھ شجاع الدولہ کے افسروں میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ یا یوں کہئے کہ روپیہ اور وعدوں کے ذریعے اختلافات پیدا کرا دئے گئے۔ اور میر قاسم کے ساتھ نہایت ناروا سلوک کیا گیا۔

انگریزوں نے میجر منرو کو ہدایت کی کہ یہی موقعہ ہے فوراً جنگ شروع کر دو۔ ورنہ اگر افغان یا مرہٹے میر قاسم اور نواب کی مدد کے لئے آ گئے۔ تو جنگ کا نقشہ ہی پلٹ جائے گا۔ غرضکہ بکسر میں جنگ چھڑ گئی نواب کے افسر جو پہلے ہی سازش کا شکار ہو چکے تھے وہ کیا لڑتے۔ ۱۵ ستمبر ۱۷۶۴ء کو نواب وزیر اودھ کو شکست ہو گئی۔ میر قاسم فرار ہونے کے بعد قعرِ گمنامی میں جا پڑا۔ مغل بادشاہ شاہ عالم اس جنگ کے بعد خود ہی انگریزوں کے کیمپ میں دوستی کے اظہار کے لئے پہنچ گیا۔ غرضکہ بکسر کی لڑائی سے نواب وزیر اودھ کو تو بے حد نقصان اُٹھانا پڑا۔ لیکن انگریزوں کے اقبال کا ستارہ چمکنے لگا۔

اودھ پر بھی انگریزوں کا اقتدار

بکسر کی جنگ کے بعد نواب شجاع الدولہ چاہتا تھا کہ انگریزوں سے اُس کا قضیہ ختم ہو جائے۔ لیکن انگریزوں نے ایسی سخت شرائط پیش کیں جن کو نواب نے تسلیم نہ کیا۔ چنانچہ جنگی سرگرمیاں دوبارہ شروع ہو گئیں۔ انگریز سپاہیوں نے الہ آباد کا رُخ کر کے اُسے فتح کر لیا۔ میر قاسم کی طرح شجاع الدولہ کو بھی فرار ہونا پڑا۔ اُس نے مرہٹوں اور روہیلوں سے مدد لینا چاہی۔ ملہار راؤ ہلکر تو شجاع الدولہ کی امداد کے لئے آ گیا۔ مگر روہیلوں نے کوئی مدد نہ دی۔ شجاع الدولہ کو ناکامی ہوئی۔ اُس کی ساری مملکت انگریزوں کے قبضہ

میں چلی گئی اور اُسے مندرجہ ذیل شرائط پر انگریزوں سے دَب کر صلح کرنی پڑی۔

"شجاع الدولہ کو پچاس لاکھ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کرنا ہوگا الہ آباد کا صوبہ مغل بادشاہ شاہ عالم کے ذاتی اخراجات کے لئے علحدہ کر دیا جائے گا۔ نیز الہ آباد کا قلعہ بھی بادشاہ کے لئے خالی کرا دیا جائے گا۔ انگریز سپاہیوں کا ایک فوجی دستہ بادشاہ کی حفاظت کے لئے الہ آباد میں رہے گا۔ شجاع الدولہ کو اپنے دربار میں انگریز وکیل رکھنا ہوگا۔"

اس طرح انگریز فوج بھی اودھ میں پہنچ گئی۔ مغل بادشاہ بھی انگریزوں کا نظر بند ہو گیا۔ اور انگریزوں کا نمائندہ بھی اودھ کے دربار میں دخیل ہو گیا۔ غرضکہ انگریزوں نے اودھ پر بھی ہاتھ رکھ دیا۔ اور مغل بادشاہ کو بھی قبضہ میں لے لیا اسی دوران میں غدّار میر جعفر بھی مر گیا اور انگریزوں کو ایک نئے کٹ پتلی نواب کی تلاش ہوئی۔

بنگال میں نجم الدولہ کی تخت نشینی

ناپاک مقاصد کی تکمیل کے بعد فروری ۱۷۶۵ء میں میر جعفر کے بیٹے نجم الدولہ کو انگریزوں نے بنگال بہار اور اُڑیسہ کے تخت پر بٹھا دیا۔

حسب دستور کمپنی کے ڈائرکٹروں نے پہلے تو نواب کے ذریعہ اپنی جیبیں گرم کیں۔ اس کے بعد نواب سے نئے معاہدے ہوئے جن کی رُو سے نواب کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ انگریزوں کے ایک پٹھو محمدؐ رضا خاں کو اپنا نائب مقرر کرے۔ نیز یہ طے پایا کہ محکمہ دیوانی کے تمام عہدہ داروں کا تقرر اور علحدگی حکومت کلکتہ یعنی انگریزوں کے ایما سے ہوگی۔ نواب پانچ لاکھ روپیہ بدستور کمپنی کو ادا کرتا رہے گا۔ نواب اس سے زیادہ فوج نہیں رکھے گا جتنی فوج کہ

مالیانہ جمع کرنے کے انتظام کے لئے ضروری ہے۔ انگریز تاجر نواب کی حدود مملکت میں ہر قسم کے محصولوں سے آزاد ہوں گے۔

انگریزوں نے ان ذلت آمیز شرائط کے بعد بنگال کے اِس آخری نواب کو قطعی مفلوج کر دیا۔ اور سارے اختیارات انھوں نے نواب کی آڑ لے کر اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ نواب کو اور زیادہ جکڑنے کے لئے انگریز چاہتے تھے۔ کہ نواب انگریزوں کے ایک دوسرے پٹھو نند کمار کو بھی اپنا دیوان بنا لے لیکن نواب نے اس کو دیوان بنانے کی بجائے گرفتار کر کے کلکتہ روانہ کر دیا۔

کلایو دوسری بار بنگال کا گورنر

کلایو کے خلاف اگرچہ انگلستان میں عام ناراضگی پھیلی ہوئی تھی اور اُس کی بے ایمانی اور بد دیانتی کے افسانے انگلستان کے بچے بچے کی زبان پر تھے لیکن پھر بھی کلایو انگلستان کے لئے ایک لائق چور اور ہونہار ڈاکو تھا جس نے کہ بڑی قابلیت کے ساتھ ہندوستانی علاقوں پر قبضہ جما کر سات سمندر پار کے ماہی گیروں کے لئے ہندوستان کے خزانے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ چنانچہ پانچ سال انگلستان رہنے کے بعد کلایو کو برطانوی ہائی کمانڈ نے دوبارہ بنگال کا گورنر بنا کر مئی ۱۷۶۵ء میں لارڈ کا خطاب عطا کر کے مزید لوٹ اور غارتگری کے لئے ہندوستان بھیج دیا۔

کلایو کی غیر موجودگی میں کمپنی کا نظام بالکل درہم و برہم ہو چکا تھا۔ اور کمپنی کے ملازموں نے ناجائز تجارت اور لوٹ کھسوٹ کے ذریعہ اچھی طرح اپنی جیبیں بھری تھیں۔ جس سے کلایو کو سخت ناگواری ہوئی۔ چنانچہ اُس نے آتے کے ساتھ ہی بورڈ آف ڈائرکٹرس لندن کو کمپنی کے ملازمین کی شکایت لکھی۔

کمپنی کے ملازموں کی ان تمام لغزشوں کے باوجود اس سے اِنکار نہیں

کیا جا سکتا کہ کلایو کے جانشینوں نے ہندوستانیوں کے گلے پر چھری پھیرنے کے معاملہ میں کلایو کی صحیح معنوں میں تقلید کی تھی۔ یہ کلایو کے پیچھے نہایت عیاری اور مکاری کے ساتھ نئے نئے نوابوں کو تخت نشین اور معزول کر کے کمپنی کے لئے علاقوں پر علاقے ہتھیاتے رہے تھے۔ بکسر جیسی اہم لڑائیاں یہ جیت چکے تھے۔ اودھ پر بھی انھوں نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اور مغل بادشاہ پر بھی قابو پا لیا تھا۔ غرضکہ انھوں نے کلایو کی مکارانہ پالیسی کے لئے اچھا خاصا میدان تیار کر دیا تھا۔

بادشاہ کی عنایت سے انگریز مغلوں کے جانشین

انگریزوں کی سرگرمیاں

اس وقت تک صرف صوبوں کے نوابوں ہی تک محدود تھیں لیکن کلایو جو اس مرتبہ اپنی "اعلیٰ خدمات" کے صلہ میں لارڈ بن کر لندن سے واپس آیا تھا۔ اُس کے سامنے ایک نہایت ہی وسیع پروگرام تھا۔ "ہندوستانیوں کو ہمیشہ کے لئے غلام بنانے کا اور مغل بادشاہ سے شاہی اختیارات چھیننے کا۔"

وہ آتے ہی سب سے پہلے بنارس میں شجاع الدولہ نواب اودھ سے ملا۔ اور اس سے اُس عہد نامہ کی تصدیق کرائی۔ جس کی رُو سے وہ پہلے ہی انگریزوں کی غلامی کا پٹہ لکھ چکا تھا۔ اس کے بعد وہ بنارس سے شاہ عالم کے پاس الہ آباد آیا تاکہ اس بوڑھے اور بے عقل بادشاہ کو شیشہ میں اُتار کر ہندوستانیوں کی ہڈیوں پر برطانوی امپیریلزم کی عمارت کھڑی کر سکے۔

مغل بادشاہ شاہ عالم اپنی کمزوریوں کی بنا پر پہلے ہی انگریزوں کی جانب جھکا ہوا تھا اور بکسر کی لڑائی کے بعد انگریزوں سے اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لئے خود ہی انگریزوں کے کیمپ میں چلا گیا تھا۔ کلایو جیسے چالاک اور عیار آدمی

کے لئے اُسے ہموار کر لینا کیا دُشوار تھا۔ چنانچہ بادشاہ اور کمپنی کے درمیان ۱۷۶۵ء میں ایک عہدنامہ مرتب ہوگیا جس کی رُو سے بادشاہ نے بنگال۔ بہار اور اڑیسہ کی دیوانی یا با الفاظ دیگر نوابی ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ کی حقیر رقم کے معاوضہ میں انگریزوں کو بخش دی۔ اور بطور جاگیر بنارس اور غازی پور کے علاقے بھی کمپنی کو عطا فرما دئے۔ یعنی اس نااہل بادشاہ نے خود اپنے ہی قلم سے ہندوستانیوں کے محضر قتل پر دستخط کر دئے۔

صرف یہی نہیں ہوا بلکہ اس کے ساتھ ہی بے عقل بادشاہ نے انگریزوں کو اُن تمام اضلاع کا در و بست مالک و مختار بنا دیا۔ جو انھوں نے لُوٹ میں ہندوستانیوں سے چھینے تھے۔ اس کے علاوہ کرناٹک جو سلطنت حیدر آباد کا ایک ماتحت صوبہ تھا۔ اس بادشاہ نے حیدر آباد سے جُدا کر کے کمپنی کے قبضہ میں دیدیا۔ اور شمالی سرکار کا علاقہ بھی انگریزوں کو عطا ہو گیا۔ غرضکہ انگریز ہندوستانیوں کے ایک تہائی سے بھی زائد کلیدی علاقوں کے مالک بن گئے۔

زمانہ کا انقلاب دیکھئے کہ وہ مغل بادشاہ جنہوں نے ہندوستان کی زمین کے ایک ایک چپہ کے لئے اپنے خزانے کھول دئے ہوں۔ اور لاکھوں جانوں کو بھینٹ چڑھا دیا ہو۔ اُن ہی مغل بادشاہوں کا ایک نالائق بیٹا۔ اپنے ملک کو انگلستان کے اُن ماہی گیروں کو سستے داموں دے ڈالتا ہے۔ جن کا ہندوستان سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا اور جو محض ہندوستانیوں کا خون چُوسنے کے لئے اس ملک میں آئے تھے۔

نواب نجم الدولہ کی پُر اسرار موت

کلائیو کو جو کچھ لینا تھا وہ اس نے لے لیا۔ اُس کا مشن پورا ہو گیا۔ اُس نے ہندوستانیوں کی غلامی اور تباہی اور انگریزوں کی حکمرانی

اور خوشحالی کی بُنیاد ہندوستان میں مضبوط کردی۔ کلایو اس اہم کارنامہ کی انجام دہی کے بعد کلکتہ پہنچا۔ تاکہ وہاں اطمینان اور سکون کے ساتھ برطانوی حکومت کی تعمیر و ترقی کی مزید تدابیر پر غور کرسکے۔

مغل بادشاہ سے سندِ حکومت لینے کے بعد بنگال کے نواب نجم الدولہ کی حیثیت محض ایک کٹ پتلی کی رہ گئی تھی جس کو پنشن دیکر کلایو نے عضو معطل بنادیا تھا لیکن اس کے بعد ہی اچانک نواب کی موت واقع ہوگئی۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ کلایو کچھ روز کے بعد جب مرشد آباد آیا اور شاہی باغ میں مقیم ہوا تو نوجوان نواب نجم الدولہ نے کلایو کی خوب خاطر و مدارات کی لیکن یہ خاطر و مدارات نواب کو راس نہ آئی۔ کیونکہ رات کو جب وہ کلایو اور کلایو کے پٹھو رضا خاں کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد محل پہنچا تو جاتے ہی مرگیا۔ اُسے زہر دیدیا گیا اور دینا بھی چاہئے تھا۔ اُس کی اب ضرورت ہی کیا باقی رہ گئی تھی۔

بنگال اور جنوبی ہند پر انگریزوں کی حکومت

بنگال۔ بہار۔ اُڑیسہ شمالی سرکار اور کرناٹک پر حکمرانی کے اختیارات بادشاہ سے حاصل کرنے کے بعد کلایو نے ملک کے نظم و نسق کی جانب توجہ کی۔ لیکن کلایو کے لئے سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ کمپنی کے جتنے بھی ملازم تھے۔ وہ سب کے سب سو فی صدی بے ایمان تھے۔ ان کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ ہندوستانیوں کا خون چوسیں۔ اُنھیں مفلس بنائیں اور اپنی دولتمندی میں اضافہ کرتے چلے جائیں کلایو ہر چند ان کی اصلاح کی کوشش کرتا لیکن اُس کلایو کے وعظ کو کون سُن سکتا تھا جس کا دامن سب سے زیادہ داغدار تھا۔

کلایو کو مجبوراً ان ہی آدمیوں سے کام لینا پڑا چنانچہ جو انگریز کل سـٹـرکوں پر

دوکان لگائے بیٹھے تھے۔حکومت کی کرسیوں پر دکھائی دینے لگے کلایو نے بنگال کے انتظام پر قابو حاصل کرنے کے لئے ڈوئل سسٹم یعنی دوعملی کا طریقہ شروع کیا۔ گاؤں اور قصبے مہاجنوں کو ٹھیکہ پر دیئے جانے لگے۔ دو ہندوستانی نائب دیوان بھی انتظام کو چلانے کے لئے رکھے گئے۔ جن میں سے ایک مشہور غدار وطن محمد رضا خاں تھا اور دوسرا انگریزوں کا پٹھو شتاب رائے تھا۔ یہ دونوں حکومت کے تقریباً تمام صیغوں اور محکموں کو چلانے کے ذمہ دار تھے۔ گویا ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے انگریزوں کی جو سب سے پہلی کیبنٹ بنی۔ اُس کا دوسرا نام "کلایو رضا اور شتاب رائے اینڈ کمپنی تھا"۔

ہندوستان کی حکومت ملنے سے قبل جب کمپنی کے ملازم رشوتیں لیتے تھے اور بے ایمانیاں کرتے تھے تو انگلستان کے ہائی کمانڈ کو ذرا بھی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب چونکہ انگریز ہندوستان کے حکمران بن گئے تھے۔ اور رشوت ستانی اور بے ایمانی سے انگریزی حکومت کے خزانے کو نقصان پہنچتا تھا۔ اس لئے بیحد سختی شروع ہوگئی۔ آدھے سے زیادہ کمپنی کے ملازم بے ایمانی اور رشوت ستانی کے جُرم میں نکال دیئے گئے۔ جو باقی رہ گئے تھے۔ وہی کون سے ایماندار تھے۔ مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ حالت بہتر ہوگئی۔ مگر اس سختی کی وجہ سے کلایو کے دشمنوں کا حلقہ ہندوستان سے لے کر انگلستان تک بڑھ گیا۔

کلایو کا عبرت انگیز انجام

کلایو دس برس ہندوستان پر حکومت کرنے کے بعد ۱۷۶۷ء میں جب لندن پہنچا تو اس پر چاروں طرف سے یورش شروع ہوگئی۔ پارلیمنٹ میں اُس کے ظلم اور غارتگری کے خلاف نعرہ بلند کیا گیا۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا جس کی صفائی میں اُسے لمبی لمبی تقریریں کرنی پڑیں۔ آخر پارلیمنٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ "گو یہ درست ہے کہ

اُس نے ہندوستان کے اُمرا سے اور دیگر ذرائع سے بے اندازہ روپیہ وصول کیا مگر اسی کے ساتھ اس نے وطن کی بھی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے"۔ یعنی رشوت اور بے ایمانی کے ثابت ہونے کے باوجود محض اس لئے کلائیو کو بری الذمہ قرار دیدیا گیا۔ کیونکہ اُس نے ہندوستانیوں کو غلام بنانے کی اہم ترین خدمت انجام دی تھی۔

کلائیو قانون کے پنجے سے تو نکل گیا۔ مگر اُس کا ضمیر برابر اُس پر ملامت کرتا رہا اور اُس کے ضمیر کی آواز نے اُسے اس قدر تنگ کیا کہ اُس نے ۱۷۷۴ء میں بے حد دولتمند ہونے کے باوجود خودکشی کرلی۔ کس قدر عبرتناک انجام ہے۔ ایک ظالم اور عیّار کا۔ صرف کلائیو ہی کا یہ انجام نہیں ہوا۔ بلکہ فرانسیسی گورنر ڈوپلے جس نے ہندوستانیوں پر بے پناہ مظالم کئے تھے۔ انتہائی ذلّت کے ساتھ افلاس اور تنگدستی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرا۔ اب رہے جنرل بُسی اور جنرل لالی جنہوں نے کہ ہندوستانیوں کے خون سے اچھی طرح اپنے ہاتھ رنگے تھے۔ ان دونوں کو فرانس کی حکومت نے پھانسی پر لٹکا دیا۔ یہ ہے ظالموں جابروں اور ہندوستان کے غاصبوں کا دردناک انجام۔

تیسرا باب

انگریزوں کا

شرمناک دورِ حکومت

۱۷۶۶ء تا ۱۸۵۷ء

انگریزوں کا شرمناک دورِ حکومت

انگریز نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اس برِ عظیم کو غلام بنانے کے لئے ہر طرف کس طرح عیاری اور مکاری کا جال بچھا دیا تھا۔ اس پر ہم گذشتہ اوراق میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ اور بتا چکے ہیں کہ انگریز نے کس عیاری کے ساتھ محبِ وطن سراج الدولہ کو ختم کیا۔ اور اُس کے جانشینوں کے ساتھ کیسی کیسی مکاریاں کیں۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے اودھ میں جو کچھ کیا۔ اور مغل بادشاہ کو جس طرح شیشہ میں اُتارا وہ انگریز کی عیارانہ فطرت کا شاہکار ہے۔

انگریز کی عیاریاں صرف اسی حد تک ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ اُس کی عیاری اور مکاری کے اہم ترین واقعات وہ ہیں جو ہم آگے چل کر پیش کریں گے جن سے پتہ چلے گا کہ انگریز نے بنگال۔ بہار اُڑیسہ اور ملک کے دوسرے حصوں پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد کس طرح انتہائی عیاری سے کام لے کر ہندوستان کی ان تمام مقتدر طاقتوں کو کچل ڈالا۔ جو کبھی نہ کبھی ہندوستان میں اُبھر سکتی تھیں۔ اور اس ملک کو انگریز کی غلامی سے نجات دلا سکتی تھیں۔

ہندوستان کی مقتدر طاقتیں

ہندوستان کے اہم ترین حصوں پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں کو سب سے پہلے ہندوستان کی اُن مقتدر طاقتوں کی فکر ہوئی جن کو اس برِ صغیر میں تھوڑا بہت اقتدار حاصل تھا۔ انگریزوں نے حکومت کے ہاتھ میں آتے ہی اُن تمام طاقتوں کو کچلنے کا ایک نہایت ہی وسیع پروگرام تیار کر لیا جن سے کہ اُنھیں اندیشہ تھا۔

انگریزوں کو اس بات کی بڑی فکر تھی کہ ہندوستان کی مقتدر طاقتوں میں سے کوئی طاقت اُبھرنے کے بعد کہیں ہندوستان کی مالک و مختار نہ بن جائے اور انگریزوں کو ہندوستان سے محروم ہونے کے بعد دوبارہ اپنے پُرانے ماہی گیری کے پیشہ پر اکتفا نہ کرنا پڑے۔

انگریزوں نے اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لئے کیسی کیسی ابن الوقتیاں کی ہیں۔ اُن پر روشنی ڈالنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کی اُن تمام اہم طاقتوں کا تذکرہ کر دیا جائے جن سے کہ انگریزوں کو اندیشہ تھا۔ تاکہ آئندہ جو واقعات ہم بیان کرنے والے ہیں۔ اُن کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

(۱) بادشاہ:۔ مغل بادشاہ کی طاقت کیونکہ ختم ہو چکی تھی اور بادشاہ انگریزوں کا دوست بھی بن چکا تھا۔ اس لئے اُس کے تذکرہ کی کوئی خاص ضرورت تو نہ تھی۔ لیکن اس لئے بادشاہ کا تذکرہ ضروری ہے کیونکہ اکثر طاقتیں بادشاہ کو گھیر کر اپنا مطلب نکالنے کے لئے جب چاہتی تھیں اسے آلہ کار بنا لیتی تھیں۔ چنانچہ اسی اندیشہ کے پیش نظر انگریزوں کو ہمیشہ بادشاہ کی بڑی فکر رہتی تھی۔

بادشاہ جب الہ آباد سے دہلی جانے لگا تو انگریزوں نے شدید مخالفت کی کیونکہ وہ بادشاہ کو کٹھ پتلی بنا کر اپنی تلوار کے نیچے رکھنا چاہتے تھے مگر انگریزوں کی مخالفت کے باوجود بادشاہ الہ آباد سے دہلی چلا گیا۔ اور مرہٹوں نے اُسے آلہ کار بنا لیا۔ بیچارے انگریز ایک نئی تشویش میں مبتلا ہو گئے۔

(۲) مرہٹے:۔ انگریزوں کے ابتدائی دور میں مرہٹے ملک کی سب سے بڑی طاقت تھے۔ گو یہ ضرور ہے کہ پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی

نے اُن کی کمر توڑ دی تھی۔ اور یہ لاکھوں کی تعداد میں اس جنگ میں کام آ گئے تھے۔ لیکن پھر بھی ان کے اثرات جنوبی اور وسطی ہند سے لے کر شمالی ہند تک پھیلے ہوئے تھے۔

انگریزوں کے لئے اگرچہ یہ چیز اطمینان بخش تھی کہ مادھوراؤ پیشوا اور اُس کے چچا رگھوناتھ راؤ میں باربار جنگ چھڑ جاتی ہے جس سے مرہٹہ طاقت کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ مگر پھر بھی مرہٹوں کا زور کافی تھا۔ چنانچہ مالوہ میں مادھوجی سندھیا کی طاقت برابر بڑھ رہی تھی۔ جو ۱۷۷۱ء میں بادشاہ کو بھی الہ آباد سے دہلی لے آیا تھا۔ اور جس نے دہلی کے امرائے سلطنت سے مل کر روہیلوں کا زور توڑ دیا تھا۔ اس کے علاوہ ریاست اندور میں ہلکر کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ بہو اہلیہ بائی نے اس علاقہ کے مرہٹوں میں ایک خاص روح اور زندگی پیدا کر دی تھی۔ اُدھر ناگپور کا بھوسلہ خاندان بھی برابر زور پکڑ رہا تھا۔ غرضکہ مرہٹوں کی طاقت ایسی نہ تھی جسے آسانی کے ساتھ انگریز نظر انداز کر سکتے۔

(۳) نظام:۔ نظام دکن سے اگرچہ انگریزوں کی دوستی تھی لیکن یہ خیال انگریزوں کو برابر ستاتا رہتا تھا کہ انھوں نے بڑی ہیاری کے ساتھ بادشاہ سے ساز باز کر کے نظام کے حلق سے کرناٹک کا وسیع علاقہ نکال لیا ہے۔ اس لئے نظام بھی اس حرکت پر انگریزوں سے ناراض تھا مگر وہ خاموش تھا۔

انگریز جب یہ دیکھتے تھے کہ نظام دکن پیشوا کے چچا رگھوناتھ راؤ اور ناگپور کے راجہ بھونسلہ کی امداد کے لئے بار بار کھڑا ہو جاتا ہے۔ تو وہ اس فکر میں پڑ جاتے تھے۔ کہ کہیں نظام اور مرہٹہ سرداروں میں مستقل اتحاد ہو گیا تو انگریزوں کا ٹھکانا کہاں رہے گا اور یہ امر واقعہ ہے کہ اگر انگریزوں کے ابتدائی دور میں مرہٹے نظام اور چند دوسری طاقتیں حب الوطنی کے جذبے کے ماتحت متحد ہو جاتیں تو ہندوستان کی موجودہ تاریخ

بالکل مختلف ہوتی۔

(۴) روہیلے:۔ انگریزوں کے ابتدائی دور میں روہیلے بھی بہت بڑی طاقت تھے۔ جو روہیلکھنڈ کے علاقے سے لے کر اودھ تک چھائے ہوئے تھے جس علاقہ پر یہ قابض تھے وہ کسی صورت میں ۱۲ ہزار مربع میل سے کم نہ تھا۔ اس جنگجو اور بہادر قوم کی تعداد ۶ لاکھ سے زیادہ تھی۔ یہ چھوٹے چھوٹے قبائل میں بٹے ہوئے تھے جن کا سردار حافظ رحمت خاں تھا لیکن پھر بھی یہ پوری طرح متحد نہ تھے۔ اگر یہ بہادر قوم متحد ہو جاتی۔ تو شاید یہی آگے چل کر ہندوستان کی فرمانروائی کی مستحق قرار دی جاتی۔

انگریز اس قوم کو بڑی تشویش کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن یہ سوچ کر ان کو بڑی حد تک سکون ہو جاتا تھا کہ ان کا یار وفادار نواب اودھ روہیلوں کا مخالف ہے اور اس خیال سے اور بھی تسلی ہو جاتی تھی کہ مرہٹے بھی ان کے حامی نہیں ہیں۔

(۵) حیدر علی:۔ نواب میسور حیدر علی کا وجود انگریزوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ تھا۔ یہ کرناٹک کے شمال میں بالکل انگریزوں کی کھوپڑی پر مسلط تھا۔ حیدر علی کسی زمانہ میں راجہ میسور کی فوج میں معمولی سپاہی تھا۔ پھر یہ رسالدار بنا۔ پھر فوجوں کا سپہ سالار ہو گیا۔ دیوان ریاست جس نے کہ راجہ کو احمق بنا رکھا تھا اُس سے حیدر علی کی چل گئی۔ حیدر علی اور دیوان میں جنگ ہوئی راجہ اور دیوان شکست کھانے کے بعد گرفتار ہو گئے۔ اور حیدر علی نے ۱۷۶۶ء میں اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا۔

حیدر علی نے میسور کو فتح کرنے کے ساتھ ہی اس گمنام ریاست میں نئی روح اور زندگی پیدا کر دی۔ حیدر علی سے نظام کو بھی ڈر تھا۔ اور انگریز بھی اس سے بجد خائف تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر دکن میں صرف نظام اور حیدر علی متحد ہو جاتے۔ تو

انگریزوں کا کہیں ٹھکانا نہ رہتا۔

(۶) سکھ:۔ سکھوں سے انگریز بے فکر تھے۔ کیونکہ وہ انگریزوں سے بہت دور پنجاب میں تھے۔ اور احمد شاہ ابدالی کی بار بار یورش نے ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ ان کی سرگرمیاں سپاہیانہ ہونے کے مقابلہ میں ظالمانہ زیادہ تھیں۔ یہ ملک فتح کر کے خوش نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ شہری اور دیہاتی آبادی کا قتلِ عام کر کے اور عبادت خانے مسمار کر کے، بے حد مسرور ہوتے تھے لیکن پھر بھی انکی سرگرمیاں کسی نہ کسی حد تک جاری تھیں اور انگریز چاہتے تھے کہ ان کی تخریبی سرگرمیاں جاری رہیں تاکہ پنجاب اور شمالی ہند کے فوجی اسپرٹ رکھنے والے مسلمانوں کو انگریزوں کی جانب رُخ کرنے کی فرصت ہی نہ مل سکے۔ اس کے علاوہ انگریز سکھوں کو شمال و مغربی علاقہ کے حملہ آوروں کے لئے ایک روک بھی بنائے رکھنا چاہتے تھے۔

(۷) راجپوت:۔ راجپوتوں کے نام سے انگریزوں کو ضرور تشویش ہوتی تھی کیونکہ ان کی جرات اور بہادری کے افسانے یہ اکثر سنتے رہتے تھے لیکن راجپوتوں سے کیونکہ ان کو براہ راست خطرہ نہ تھا۔ اس لئے اُن کی یہ تشویش زیادہ نہیں بڑھنے پاتی تھی۔ مگر پھر بھی انگریز یہ نہیں چاہتے تھے کہ راجپوت اُبھریں اور ترقی کریں۔

یہ تھیں انگریزوں کے ابتدائی دور کی قابلِ تذکرہ طاقتیں جن کی نقل و حرکت کا انگریز بیٹھے ہوئے بڑی سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کر رہے تھے۔ اور دن رات اس فکر میں رہتے تھے کہ ان طاقتوں کو کیونکر آپس میں لڑایا جائے اور ان کا زور کس طرح ختم کیا جائے تاکہ ان طاقتوں کے ختم ہونے کے بعد ہمیشہ کے لئے وہ ہندوستان کی جانب سے بے فکر ہو جائیں۔ انگریز جو کچھ سوچتا ہے وہ کرتا ضرور ہے۔ چنانچہ اُس نے ان طاقتوں کو ختم کرنے میں اہم ترین پارٹ ادا کیا۔ کسی کو دوست بن کر مارا تو کسی کو دشمن بن کر کچلا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

حیدر علی اور انگریزوں میں پہلی جنگ

ہندوستان کی مقتدر طاقتوں کو کچلنے کی جو پالیسی انگلستان کے ہائی کمانڈ اور بنگال کے نئے سفید فام حاکموں نے مل کر تیار کی تھی۔ اُس کی ابتدا انگریزوں نے نظامِ دکن اور مرہٹوں کو اپنے ساتھ متحد کرنے کے بعد ۱۷۶۶ء میں پہلی جنگ میسور سے شروع کر دی۔

تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ آخر غریب حیدر علی کا وہ کونسا قصور تھا جس کی پاداش میں گورے سپاہی اُس کے ملک پر اچانک جا چڑھے۔ انگریز مورخ اس بے سبب جنگ کے داغ کو یہ کہہ کر دھونے کی ناکام کوشش کرتے ہیں کہ انگریز تو محض مرہٹوں اور نظام کے کہنے سے اس خواہ مخواہ کی لڑائی میں شریک ہو گئے تھے۔ اور اُس کے ساتھ ہی یہ بھی فرماتے جاتے ہیں کہ نظام اور مرہٹے تو حیدر علی سے ساز باز کر کے الگ ہو گئے مگر انگریزوں کو اس لڑائی کی ساری مصیبت خود جھیلنی پڑی۔

ذرا غور کیجیے کہ اگر نظام یا مرہٹے اس جنگ کے اصل محرک تھے۔ تو انگریز جیسی مضبوط طاقت کے ان کے ساتھ شامل ہونے کے بعد تو ان کی ہمت اور بھی بڑھ جانی چاہیئے تھی۔ نہ یہ کہ وہ انگریزوں کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ اور اگر ان کو حیدر علی سے ساز باز کرنی تھی تو جنگ کے لئے میدان میں آنے اور انگریزوں کو جنگ کے لئے اُبھارنے کی ان کو ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ تو پہلے ہی حسبِ مرضی حیدر علی سے سمجھوتہ کر سکتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حیدر علی کیونکہ کرناٹک کے شمال میں انگریزوں کی کھوپری پر سوار تھا۔ اس لئے انگریز چاہتے تھے کہ سب سے پہلے اُسے کچل ڈالا جائے تاکہ میسور پر قبضہ جمانے کے بعد ایک طرف تو انگریز اس مضبوط حکومت سے بے فکر

ہو جائیں اور دوسری طرف انگریز میسور میں بیٹھ کر نظام اور مرہٹوں کو دھمکا سکیں۔

انگریزوں نے اپنے اس ناپاک مقصد کی تکمیل کے لئے دباؤ ڈال کر پہلے تو نظام اور مرہٹوں کو اپنے ساتھ اس جنگ میں شامل کیا۔ پھر بلا وجہ میسور پر یورش کر دی۔ نظام اور مرہٹے یا تو انگریزوں کے چال کو سمجھ گئے یا اور کسی خاص وجہ سے انھوں نے اس طویل جنگ میں زیادہ مدت تک انگریزوں کی خاطر اپنے آدمی اور روپیہ برباد کرنا نہیں چاہا۔ چنانچہ انگریزوں کو بُری طرح نہ صرف شکست ہوگئی بلکہ حیدر علی نے اُلٹا حملہ کرکے سارے کرناٹک کو تاراج کر ڈالا۔ اور مدراس تک جا پہنچا۔

انگریزوں نے جب دیکھا کہ پانسہ اُلٹا پڑا۔ تو حیدر علی سے صلح کی درخواستیں کرنی شروع کیں۔ چنانچہ انگریزوں کو حیدر علی کی من مانی شرطوں پر دب کر صلح کرنی پڑی اور یہ وعدہ کرنا پڑا کہ اگر میسور پر کوئی بھی حملہ کرے گا تو انگریز جان و دل سے حیدر علی کا ساتھ دیں گے۔ حیدر علی نے بھی انگریزوں کی امداد کا وعدہ کر لیا۔ غرضکہ اس جنگ میں انگریزوں کو بُری طرح شکست ہوئی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔

حیدر علی سے انگریزوں کی بدعہدی

حیدر علی سے شکست کھانے کے بعد انگریزوں کو خود تو حیدر علی سے ٹکر لینے کی ہمت نہ ہوئی لیکن انھوں نے اپنی ریشہ دوانیوں سے ایسے حالات پیدا کر دئے کہ ۱۷۷۱ء میں حیدر علی اور مرہٹوں میں سخت ترین جنگ چھڑ گئی۔ انگریز اس لڑائی سے بے حد خوش تھے۔ کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ جنوبی ہند کی دو بڑی طاقتوں کی یہ جنگ اُن کے لئے فال نیک ہے۔ اُن کی تو پالیسی ہی یہ تھی کہ "آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو۔"

حیدر علی اور انگریزوں کے سابقہ معاہدہ کے مطابق انگریزوں کا فرض تھا کہ وہ مرہٹوں کے مقابلہ میں حیدر علی کی امداد کرتے۔ اس کے علاوہ انگریزوں اور

حیدرعلی کی سابقہ جنگ میں چونکہ مرہٹے انگریزوں کو تنِ تنہا میدان میں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اس لئے اُن سے انتقام لینے کا بھی انگریزوں کے لئے یہ بہترین موقعہ تھا لیکن جب حیدرعلی نے مرہٹوں کے خلاف انگریزوں کو امداد کے لئے بلایا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ شاید اس لئے کہ انھوں نے ہی تو مرہٹوں کو حیدرعلی کے خلاف اُبھارا تھا۔

حیدرعلی کو محض انگریزوں کی ریشہ دوانی اور بدعہدی کی بنا پر مرہٹوں کے مقابلے میں شکست ہو گئی۔ غریب حیدرعلی کو ۳۶ لاکھ روپیہ اور اپنی حکومت کے کچھ علاقے دیکر مرہٹوں سے صلح کرنی پڑی۔ انگریز خوش تھے کہ اُن کے سب سے بڑے دشمن کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ اور حیدرعلی کے تن بدن میں آگ لگ رہی تھی کہ انگریزوں نے عین وقت پر اُس کے ساتھ دغا کی ہے۔

حیدرعلی پر فتح پانے کے بعد وہ مرہٹے جو پانی پت کی لڑائی کے بعد مُردہ ہو گئے تھے۔ اُن میں پھر نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ انھوں نے دریائے چمبل پار کر کے راجپوتانہ کو فتح کر لیا۔ جاٹوں سے ۶۵ لاکھ روپیہ وصول کیا۔ اور دہلی تک پھیل گئے۔ مرہٹوں کی فوجوں نے روہیلوں کے علاقہ کو تاراج کو ڈالا اور مغل بادشاہ کو الہ آباد سے دہلی لانے کے بعد مرہٹوں نے اسے اُس طرح اپنے قبضہ میں لے لیا کہ مغل بادشاہ بالکل مرہٹوں کے رحم و کرم پر تھا۔

انگریز اس بات سے تو مرہٹوں سے خوش تھے کہ انھوں نے حیدرعلی کو شکست دیدی۔ اور انھوں نے روہیلوں کو کچلا۔ مگر وہ اسے ناپسند کرتے تھے کہ مرہٹوں کی طاقت اتنی بڑھ گئی ہے کہ انھوں نے مغل بادشاہ کو بھی اپنی مٹھی میں لے لیا ہے۔

بنگال کا نیا گورنر ہسٹنگز

وارن ہسٹنگز نے بطور ریزیڈنٹ مُرشد آباد اور کلکتہ کونسل کے ممبر کی حیثیت سے انگریز قوم

کے لئے جو اہم خدمات انجام دی تھیں یا با الفاظ دیگر ہندوستانیوں کی گردن پر جو چھری پھیری تھی اس کے صلہ میں ۱۷۷۲ء میں اسے بنگال کے گورنر کا اہم عہدہ عطا کر دیا گیا۔ انگریز مورخوں نے وارن ہسٹنگز کی قابلیت اور اعلیٰ استعداد کے خوب گن گائے ہیں، اور انھیں ایسا کرنا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ لارڈ کلایو کے بعد وارن ہسٹنگز ہی وہ دوسری شخصیت تھی کہ جس نے فاقہ زدہ ہندوستانیوں کے لاشوں پر کھڑے ہو کر انگریزی اقتدار کا پھریرا لہرایا۔

ہسٹنگز کے بارے میں انگریز خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں لیکن جہاں تک ہندوستانی نقطۂ نظر کا تعلق ہے ہسٹنگز ایک عیار اور مکار سیاست داں تھا جس نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر زور شور سے عمل کر کے ہندوستانیوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ اس کے علاوہ بے ایمانی اور ناجائز حصول زر میں بھی وہ کسی طرح اپنے پیش رو حاکموں سے پیچھے نہ تھا لیکن پھر بھی وہ کمپنی کے ملازموں کو ایمانداری کے وعظ سناتا رہتا تھا۔ مگر اس کے پند و نصائح کا وہی اثر ہوا جو ایک بے عمل ناصح کی نصیحتوں کا اثر ہوا کرتا ہے۔

وارن ہسٹنگز نے ۱۷۷۲ء میں ہندوستان آکر جب اپنا عہدہ سنبھالا تو کمپنی کی مالی حالت بڑی نازک تھی۔ اس لئے نہیں کہ کمپنی کو کوئی آمدنی نہ تھی بلکہ اس لئے کہ کمپنی کی آمدنی کا ایک حصّہ تو بے ایمان ملازمین کی جیبوں میں چلا جاتا تھا اور باقی جو کچھ بچتا تھا وہ ملک گیری کی کوششوں پر قربان کر دیا جاتا تھا۔ وارن ہسٹنگز نے آتے کے ساتھ ہی بعض ایسی اصلاحات کیں جن سے کمپنی کے ملازموں کی ناجائز آمدنی میں زیادہ سے زیادہ کمی ہو سکے۔

ہسٹنگز نے کالے اور گورے کا نسلی امتیاز بھی شروع کر دیا۔ یعنی کالے کلکٹروں کی جگہ گورے کلکٹر رکھے جانے لگے لیکن جب گورے کلکٹر اپنی ناتجربہ کاری اور زبان

سے ناواقفیت کی بنا پر ٹھیک طریقہ پر کام نہ چلا سکے تو مجبوراً ہسٹنگز کو پھر کالوں کا سہارا لینا پڑا۔

وارن ہسٹنگز کو کالوں سے کس قدر نفرت تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزوں کے وفادارانِ ازلی محمد رضا خاں۔ اور راجہ شتاب رائے بھی کمپنی کی ملازمت سے برطرف کر دئیے گئے۔ یہ دونوں وہی بزرگ ہیں جنہوں نے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ غدّاری کر کے انگریزوں کو بے حد فائدہ پہنچایا تھا ان دونوں کو صرف برطرف ہی نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان پر غبن اور بددیانتی کے جرم میں مقدمہ بھی چلایا گیا لیکن چند ہی روز کے بعد یہ دونوں بَری کر دئیے گئے۔ اس لئے نہیں کہ قانون اور انصاف نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ بلکہ اس لئے کیونکہ لاکھوں روپیہ کی رشوت کی بنا پر اب ہسٹنگز کو ان دو کالوں سے نفرت باقی نہیں رہی تھی۔

ہسٹنگز نے کلایو کی دوعملی کی پالیسی کو ختم کر دیا۔ دیوانی اور فوجداری کے دفاتر مرشد آباد سے کلکتہ منتقل کر دئیے گئے۔ شاہی خزانہ بھی کلکتہ منتقل ہو گیا۔ ہر ضلع میں انگریزی عدالتیں قائم کی گئیں جو سابقہ قوانین اور رواج کے مطابق مقدمات فیصل کرتی تھیں۔ کلکتہ ہندوستان میں برطانوی مقبوضات کا دارالسلطنت قرار دیا گیا۔ جو ۱۹۱۱ء تک باقی رہا ہسٹنگز نے کمپنی کا خزانہ پر کرنے کے لئے نواب بنگال کے جانشین کا سالانہ وظیفہ بھی نصف کر دیا۔ اور شاہ عالم کا ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ کا خراج ایک سرے سے اُڑا دیا۔ اس کے علاوہ الہ آباد اور کڑا کے علاقے شاہ عالم سے چھین کر نواب وزیر اودھ کو چھبیس لاکھ روپے کے عوض دیدئے۔ غرضکہ جائز اور ناجائز ذرائع سے ہسٹنگز نے کمپنی کے خالی خزانے کو پُر کرنے کے لئے کوئی ناانصافی اور عہد شکنی باقی نہیں چھوڑی۔

روہیلوں کے خلاف انگریز اور نواب اودھ کا اتحاد

۱۷۷۳ء میں نواب وزیر اودھ اور ہیسٹنگز میں جو عہد نامہ ہوا تھا۔ اس عہد نامہ کی رُو سے نہ صرف الہ آباد اور کڑا کے شاہی علاقے ایک بڑی رقم کے معاوضہ میں نواب اودھ کو دیدیئے گئے تھے بلکہ اس کے ساتھ ہی نواب نے بوقت ضرورت اپنے ہاں انگریزی فوج رکھنے اور اُس سے کام لینے کی بھی ایک شرط منظور کرلی تھی۔ یہ جنگی معاہدہ کس غرض اور منشا کے ماتحت ہوا تھا۔ اس کا انکشاف ۱۷۷۴ء میں اُس وقت ہوا جب ہیسٹنگز نے نواب اودھ کی آڑلے کر اُن بہادر روہیلوں کو کچلنا شروع کردیا۔ جن کا اس وقت تک انگریزوں سے یا کمپنی سے کوئی جھگڑا نہ تھا۔

ہسٹنگز اور انگریزوں کے دامن پر یہ سب سے بڑا داغ ہے کہ انھوں نے خواہ مخواہ ایک ایسی بہادر قوم کو کچلا جن سے لڑنے کی انگریزوں کے پاس کوئی وجہ نہ تھی۔ چنانچہ پارلیمنٹ کے ممبروں سے لے کر کلکتہ کونسل کے ممبروں تک نے ہسٹنگز کی اس ظالمانہ اور جابرانہ حرکت کے خلاف سخت نکتہ چینی کی ہیسٹنگز نے روہیلوں سے یہ لڑائی نواب اودھ کی آڑلے کر لڑی اور یہ ظاہر کیا کہ چونکہ نواب اودھ کو روہیلوں سے خطرہ ہے اس لئے نواب کی خواہش پر انگریز اس جنگ میں شریک ہونے پر مجبور ہیں۔

بہادر روہیلوں نے دشمن وطن نواب اودھ اور انگریزوں کا بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ انھوں نے روہیلکھنڈ کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے ہزاروں سرفروش قربان کردئے لیکن پھر بھی روہیلوں کو شکست ہوگئی شکست بھی ایسی کہ ہزاروں روہیلہ خاندان برباد ہوگئے جو باقی رہ گئے تھے وہ ہجرت کرکے جدہر کو منھ اُٹھا چلے گئے۔ اور روہیلکھنڈ کا علاقہ انگریزوں کو چالیس لاکھ روپے میں

دینے کے بعد اودھ میں شامل کر دیا گیا۔ غرضکہ روہیلکھنڈ پر نواب اودھ اور انگریزوں نے مل کر ایسی تباہی برپا کی جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ اور یہ تباہی محض اس لئے مچائی گئی کیونکہ ہندوستان کی ایک بہادر اور خوددار قوم کو فنا کرنا مقصود تھا۔

لندن پارلیمنٹ

ایسٹ انڈیا کمپنی لندن پارلیمنٹ کے ماتحت

اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اُسکے عہدہ داروں کے معاملات میں بار بار مداخلت کرتی رہی تھی۔ مگر اس وقت تک اُسے قانونی طور پر مداخلت کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ چنانچہ انگلستان کے اُمرا اور پارلیمنٹ کے ممبروں کی طرف سے کئی سال سے برابر یہ مطالبہ ہو رہا تھا کہ چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی اب تجارتی کمپنی نہیں رہی بلکہ وہ حکمران طاقت بن گئی ہے۔ اس لئے اُس کا انتظام کمپنی کے ڈائرکٹروں کے ہاتھ سے نکال کر خود برطانوی پارلیمنٹ کو اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیئے۔

پارلیمنٹ کے ممبر اس لئے بھی کمپنی کے ڈائرکٹروں اور عہدہ داروں کے مخالف ہو گئے تھے۔ کیونکہ کمپنی کے عہدہ داروں اور ڈائرکٹروں نے ہندوستان کی لوٹ کے مال کے ذریعہ الیکشن اور دیگر معاملات میں لندن پارلیمنٹ کے ممبروں کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

لندن کے اُمرا اور پارلیمنٹ کی اس مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ لندن پارلیمنٹ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے ۱۷۷۳ء میں ریگولیٹنگ ایکٹ کے نام سے ایک قانون پاس کرنا پڑا جس کی رُو سے کمپنی کا ملکی انتظام بورڈ آف ڈائرکٹرز کے قبضہ سے نکال کر پارلیمنٹ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اسی قانون کی رُو سے کلکتہ میں چار انگریز ممبروں کی ایک کونسل بنا دی گئی۔

ان چار ممبروں کی کونسل کا صدر گورنر جنرل کو مقرر کیا گیا۔ اس جدید ایکٹ کی رُو سے ہسٹنگز پہلا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ اور یہ طے پایا کہ آئندہ تمام معاملات کا تصفیہ کونسل کے ممبروں کی کثرت رائے سے کیا جائے اور کونسل و گورنر جنرل پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوں۔ اس کے علاوہ کلکتہ میں عدالتِ عالیہ قائم کی گئی۔ یہ عدالت تاج برطانیہ کے ماتحت تھی۔ ویسے تو اس عدالت کا دائرہ حدود کلکتہ تک محدود تھا۔ لیکن اس کو حق دیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان کے ہر علاقہ کے انگریزوں اور ملازمین کمپنی کے مقدمات کی سماعت کر سکے۔ اس جدید قانون کی رُو سے ملازمین کمپنی کے لئے ذاتی تحائف قبول کرنا اور ذاتی تجارت کرنا خلافِ قانون قرار دیدیا گیا۔

ہسٹنگز اور کونسل کے ممبروں میں جھگڑا

"ریگولیٹنگ ایکٹ" کے پاس ہونے کے باوجود اکتوبر ۱۷۷۴ء سے قبل اس پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔ کیونکہ کونسل کے تین ممبر انگلستان سے آنے والے تھے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۷۷۴ء میں جب جنرل کلاورنگ۔ کرنل مونسن اور فلپ فرانسس لندن سے کلکتہ پہنچ گئے۔ تو کونسل کا کام شروع ہوا۔ چوتھا ممبر بارول کلکتہ ہی میں رہتا تھا۔ یہ کمپنی کا پُرانا ملازم تھا۔ ان تینوں ممبروں کے آتے کے ساتھ ہی ان کا جھگڑا ہسٹنگز سے شروع ہو گیا۔ ہسٹنگز اور کمپنی کا پُرانا ملازم بارول تو ایک طرف تھے اور دوسری طرف انگلستان کے تینوں نووارد ممبر تھے جنہوں نے قدم قدم پر ہسٹنگز کو شکستیں دیں اور اُسے اتنا بددل کر دیا کہ ایک دفعہ تو ہسٹنگز گورنر جنرل کے عہدہ سے استعفےٰ تک دینے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ انگلستان سے آئے ہوئے ان تینوں نووارد ممبروں کا دامن چونکہ رشوت ستانی اور بے ایمانی سے پاک تھا۔ اس لئے انھوں نے ہسٹنگز اور کمپنی

کے ملازموں کو بُری طرح شکنجہ میں کسا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ نووارد ممبروں اور ہسٹنگز میں باقاعدہ سیاسی جنگ چھڑ گئی۔

لندن پارلیمنٹ کی قائم کردہ کونسل اور اُس کی عدالتِ عالیہ کی کیا حیثیت تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہسٹنگز اور کمپنی کے دوسرے ملازمین کے منظورِ نظر ایک راجہ پر جب قرض خواہوں نے عدالتِ عالیہ میں دعویٰ کیا تو عدالت نے راجہ کو حراست میں لینے کا حکم صادر کر دیا۔ لیکن گورنر جنرل اور کمپنی کے ڈائرکٹروں نے فوج بھیج کر عدالت کے پیادوں سے مقروض راجہ کو زبردستی چھڑا لیا۔ اس توہین عدالت پر جب گورنر جنرل اور اس کے حواریوں کو باضابطہ عدالت میں طلب کیا گیا تو انھوں نے حاضر عدالت ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ تھی کلکتہ کی اس عدالت عالیہ کی حیثیت۔

ہسٹنگز کے مخالف راجہ نند کمار کو سزائے موت

ہسٹنگز جس کی شان میں برطانوی مورخوں نے بے شمار قصائد لکھے ہیں۔ اُس کے پست کیرکٹر کا اندازہ راجہ نند کمار کے اُس واقعہ سے ہو سکتا ہے جس کو ہندوستانی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ راجہ نند کمار کا قصور یہ تھا کہ اُس نے کھلے بندوں ہسٹنگز پر میر جعفر کی بیوی منی بیگم سے بہت سی رقم بطور رشوت لینے کا الزام لگایا تھا اور اس چیز کا بھی انکشاف کیا تھا کہ رضا خاں نے اپنی رہائی کے لئے خود اس کو یعنی نند کمار کو دو لاکھ روپیہ اور ہسٹنگز کو دس لاکھ روپیہ رشوت دی تھی چنانچہ نند کمار نے ان الزامات کی تائید میں بیگم کے خطوط اور بہت سے تائیدی ثبوت کونسل کے ممبروں کے پاس بھیجدئے تھے۔ نند کمار کے ان الزامات کے بعد کونسل نے

ہسٹنگز کو اپنے روبرو ایک مجرم کی حیثیت سے طلب کرنا چاہا تو ہسٹنگز نے کونسل میں پیش ہونے سے انکار کرتے ہوئے کونسل ہی کو تحلیل کر دیا۔

ہسٹنگز اور اُس کے حواریوں نے راجہ نند کمار کی اس مخالفانہ جسارت کا اس طرح جواب دیا کہ انھوں نے ایک ہندوستانی سوداگر کی جانب سے نند کمار پر جعل سازی کا جھوٹا مقدمہ قائم کرادیا۔ اور اس مقدمہ میں نند کمار کو گرفتار کر کے جیل خانہ میں بند کر دیا۔

ہسٹنگز نے جب دیکھا کہ شکار جال میں پھنس چکا ہے تو اُس نے نند کمار کا معاملہ کلکتہ کی عدالت عالیہ کے سپرد کر دیا جس کا میر عدالت وارن ہسٹنگز کا ہم مکتب "سرالجیا" تھا۔ چنانچہ ہسٹنگز کے یار یعنی اس میر عدالت کے حکم سے راجہ نند کمار کو جعل سازی کے جرم میں ۵ اگست ۱۷۷۵ء کو سزائے موت دیدی گئی اور اس طرح ہسٹنگز کا وہ سب سے بڑا مخالف ختم ہو گیا جس کے قبضہ میں ہسٹنگز کی بے ایمانیوں اور رشوت ستانیوں کے بے شمار ثبوت موجود تھے۔

ملاحظہ فرمایئے انگریزوں کی کلکتہ کی عدالتِ عالیہ کا انصاف کہ جعل سازی کے جرم میں سزائے موت دیدی جاتی ہے اور لطف یہ ہے کہ جعل سازی کا یہ واقعہ ۱۷۷۰ء کا بیان کیا جاتا ہے اور عدالتِ عالیہ ۱۷۷۴ء میں قائم ہوئی تھی یعنی اس عدالت نے اپنے پیدا ہونے سے قبل کے معاملات پر بھی سزائیں دینی شروع کر دی تھیں لیکن وہاں تو مقصد ہی کچھ اور تھا یعنی صرف نند کمار کو ٹھکانے لگانا تھا۔ اگر اس طرح نہیں تو کسی اور طرح ختم کرا دیا جاتا۔

مرہٹوں سے انگریزوں کی پہلی جنگ

۱۷۷۸ء میں مرہٹوں اور انگریزوں میں جو جنگ چھڑی تھی۔ اُس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اٹھارویں صدی میں انگریزوں کا

کیرکٹر کس قدر پست تھا۔ انگریزوں اور مرہٹوں میں جھگڑا اس طرح چھڑا کہ پونا میں مادھو راؤ پیشوا کے مرنے کے بعد اُس کا بھائی نرائن راؤ جانشین قرار دیدیا گیا۔ لیکن اُسے اس کے چچا رگھوناتھ راؤ کی سازش سے قتل کر دیا گیا اور رگھوناتھ راؤ پیشوا بن بیٹھا۔ لیکن اُس کی اس حرکت نے مرہٹوں کو اُس سے بیزار کر دیا۔ چنانچہ چند ماہ کے بعد جب مادھو راؤ پیشوا کی بیوہ کے بطن سے مادھو راؤ نرائن نامی لڑکا پیدا ہوا تو مرہٹوں نے متفقہ طور پر اس بچہ کو پیشوا تسلیم کر لیا، اور مرہٹہ قوم کے لائق سردار اور مدبّر نانا فرنویس کو مادھو راؤ نرائن کا اتالیق مقرر کر دیا۔ رگھوناتھ راؤ مالوہ بھاگ گیا اور وہاں سے سورت چلا گیا۔

انگریزوں نے جب دیکھا کہ مرہٹوں میں خانہ جنگی برپا ہے تو انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ اس خانہ جنگی سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ چنانچہ حکومت بمبئی نے رگھوناتھ راؤ کو امداد کے سبز باغ دکھا کر اُس سے سورت میں ایک عہدنامہ لکھوا لیا اور اس عہدنامہ کی رُو سے سالسٹ اور بیسن کے علاقے لے لئے اور فوراً ہی فوج بھیجکر ان پر قبضہ بھی کر لیا۔ جس سے کہ نانا فرنویس اور مرہٹہ قوم میں انگریزوں کے خلاف سخت ناگواری پیدا ہو گئی۔

"ریگولیٹنگ ایکٹ" کی رُو سے چونکہ بمبئی کونسل کو گورنر جنرل کی مرکزی کونسل کی منظوری کے بغیر اس قسم کے معاہدہ کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ اس لئے گورنر جنرل کی کونسل نے اپنے وکیل کو پُونا بھیج کر نانا فرنویس کے ساتھ ایک دوسرا عہدنامہ ۱۷۷۶ء میں کر لیا جو پورندہر کے عہدنامہ کے نام سے مشہور ہے جس میں انگریزوں نے یہ وعدہ کیا کہ کمپنی ناکام پیشوا رگھوناتھ راؤ کی کوئی مدد نہیں کرے گی اور پیشوا کے خزانے سے رگھوناتھ راؤ کو تین لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ ملا کرے گا۔ مگر سالسٹ اور بیسن کے معاملہ میں کوئی باہمی قرارداد نہ طے ہو سکی لیکن اسی دوران میں جب

لندن سے سورت کے عہد نامہ پر خوشنودی کا اظہار کیا گیا تو بمبئی کونسل گورنر جنرل کی مرکزی کونسل کی پروا کئے بغیر رگھوناتھ کی برابر اعانت کرتی رہی۔

مرہٹے یہ دیکھ کر حیران تھے کہ یہ انگریز قوم کتنی عجیب ہے کہ اس کا ایک سرکاری گروہ تو مرہٹوں کے مخالف رگھوناتھ سے ساز باز کر رہا ہے اور دوسرا سرکاری گروہ نانا فرنویس سے پینگیں بھی بڑھا رہا ہے اور رگھوناتھ کے حمایتی انگریزوں کی مذمت بھی کر رہا ہے لیکن سالسٹ اور بیسن کو ہضم کر جانیکے معاملہ میں یہ سب ملے ہوئے ہیں۔

ابھی مرہٹے انگریزوں کی پیچیدہ سیاست کی اس گتھی کو سلجھانے بھی نہ پائے تھے کہ یکایک ۱۷۷۸ء میں انگریز فوج پونا تک پہنچ گئی۔ مرہٹوں نے جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ انگریزوں کو مار مار کر پیچھے دھکیل دیا۔ یہاں تک کہ ۱۷۷۹ء میں رگھوناتھ نے اپنے آپ کو مرہٹہ سردار سندھیا کے حوالے کر دیا۔

انگریزوں نے جب دیکھا کہ ان کا یار وفادار رگھوناتھ راؤ ہتھیار ڈال کر مرہٹوں کی پناہ میں چلا گیا ہے تو انگریزی فوج کے سرداروں نے اپنی سلامتی اسی میں دیکھی کہ وہ بیسن اور سالسٹ سے دستبردار ہو جائیں۔ غرضکہ اس جنگ میں انگریزوں کو بُری طرح ناکامی ہوئی۔

اسی زمانہ میں بڑودہ کے تخت کے دو دعویداروں میں جب خانہ جنگی شروع ہوئی تو پُونا کے شکست خوردہ انگریز فتح سنگھ کے حامی بن کر گجرات پر چڑھ دوڑے۔ انھوں نے احمد آباد پر قبضہ کر لیا۔ سندھیا کی فوج پر شب خون مار کر انھوں نے فتح حاصل کر لی۔ اس کے بعد یہ گوالیار کی جانب بڑھے اور کمندیں ڈال کر گوالیار کے مستحکم قلعہ میں اُتر گئے۔ شہر بیسن بھی چند روز کے محاصرے کے بعد ان کے قبضہ میں دوبارہ آگیا۔ اس کے بعد انھوں نے پھر ایک بار ۱۷۸۱ء میں پوری طاقت کے ساتھ پونا پر حملہ کیا۔

انگریزوں کی بدقسمتی کہ اُن کو پونا کے اس معرکہ میں دوبارہ شکست ہوگئی۔ اور ان کو بے حد نقصان اُٹھاتے کے بعد پسپا ہونا پڑا۔ مرہٹوں اور انگریزوں کی ان لڑائیوں سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ آپس کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اُٹھانے میں انگریز کس قدر مشاق تھے کہ کبھی تو رگھوناتھ کے حامی بن کر انھوں نے بسین اور سالسٹ کو ہضم کرنا چاہا اور کبھی فتح سنگھ کی حمایت میں احمد آباد اور گوالیار پر قابض ہو گئے۔ یہ تھی ان انگریزوں کی عیارانہ پالیسی۔

راجہ بنارس اور بیگمات اودھ پر ظلم

مرہٹوں سے لڑنے میں چونکہ کمپنی کا خزانہ خالی ہو گیا تھا۔ اس لئے اب ہسٹنگز کو پھر جائز و ناجائز طریقہ پر روپیہ فراہم کرنے کی فکر ہوئی۔ راجہ بنارس چیت سنگھ جو انگریزوں کو ۲۲ لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرتا تھا۔ اُس سے انگریز جب چاہتے تھے دبا کر مزید رقم بھی وصول کر لیتے تھے۔ چنانچہ اس مرتبہ جب راجہ کو بُری طرح دبایا گیا۔ اور راجہ نے مزید رقم ادا کرنے پر مجبوری کا اظہار کیا تو ہسٹنگز صاحب بہادر اُس سے ایسے خفا ہوئے کہ بنارس پہنچ کر راجہ کو حراست میں لے لیا۔

راجہ بنارس کو حراست میں لیتے ہی عوام میں انگریزوں کے خلاف بیحد جوش بڑھ گیا۔ عوام نے ہلہ بول کر راجہ کو چھڑا لیا۔ اور ہسٹنگز بنارس سے فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے بعد انگریزی فوج نے بنارس پر دوبارہ حملہ کر کے راجہ چیت سنگھ کے تمام چھوٹے بڑے قلعے فتح کر لئے۔ راجہ کو بلا وجہ معزول کر دیا گیا۔ اور اُس کے ایک رشتہ دار کو زیادہ خراج ادا کرنے کے وعدہ پر گدی پہ بٹھا دیا گیا۔

ہسٹنگز کو اس ظلم وستم کے باوجود کیونکہ بنارس سے روپیہ نہیں مل سکا تھا۔ اس لئے

اب وہ انگریزوں کے یار وفادار نواب اودھ کی جانب متوجہ ہوا جس پر کہ انگریزوں کا بہت سارو پیہ چڑھا ہوا تھا۔ بات یہ ہے کہ انگریزوں نے اودھ میں مستقل گورہ فوج متعین کرکے اور غیر ضروری فوج کا نواب پر بارڈال کر اُسے بُری طرح مقروض کر دیا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ نواب کے خزانہ میں انگریزوں کا پیٹ بھرنے کے لئے روپیہ نہیں تھا۔ آخر ہسٹنگز نے روپیہ حاصل کرنے کی یہ ترکیب نکالی کہ نواب اودھ کی ماں دادی اور بیگمات اودھ کے پاس جو بھی ذاتی روپیہ اور جواہرات تھے اُن کو حکومت اودھ کی ملکیت قرار دیدیا۔

کلکتہ کونسل چونکہ اس تمام مال کو بیگموں کی ذاتی ملکیت پہلے ہی قرار دے چکی تھی اس لئے بیگموں نے اسے دینے سے انکار کر دیا لیکن نواب اودھ نے ہسٹنگز کی شہ پر جس قدر نقد روپیہ اور جواہرات مل سکے زبردستی بیگموں سے چھین لئے۔ غور فرمایئے کہ انگریز کے تنور شکم کو گرم کرنے کے لئے لاچار عورتوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا کوئی گناہ نہیں خیال کیا گیا۔ کیا اس سے بڑھ کر اخلاقی گراوٹ کی کوئی دوسری مثال ہوسکتی ہے۔

عہد نامہ سلبی کی رو سے مرہٹوں سے صلح

انگریزوں کے لئے مرہٹوں کی جنگ بے حد مہنگی پڑی۔ کمپنی کا سارا خزانہ خالی ہوگیا۔ آخر ۱۷۸۲ء میں انگریزوں کو مرہٹوں سے صلح کرنی پڑی۔ یہ صلح جس عہد نامہ کی رُو سے ہوئی وہ عہد نامہ سلبی کے نام سے مشہور ہے۔

عہد نامہ سلبی کی رُو سے انگریزوں نے مادھوراؤ نرائن کو پیشوا تسلیم کر لیا نیز قرار پایا کہ مرہٹوں کے جن علاقوں پر انگریز قابض ہیں وہ مرہٹوں کو واپس دیدئے جائیں گے صرف سالسٹ کی بندرگاہ پر انگریزوں کا قبضہ رہے گا۔ انگریزوں کے علاوہ کسی دوسری یوروپین قوم کو نہ تو پونا میں رہنے کی اجازت ہوگی اور نہ وہ تجارت کرسکے گی۔ حکومت پونا

فتح سنگھ کو بڑودہ کا راجہ تسلیم کرے گی۔ رگھوناتھ کو تین لاکھ روپیہ سالانہ پیشوا کے خزانہ سے وظیفہ دیا جائے گا۔ چنانچہ اس عہدنامہ کی رُو سے بروچ اور اُن تمام دوسرے مرہٹہ علاقوں سے انگریزوں نے فوجیں ہٹالیں جن پر کہ وہ قابض ہو گئے تھے لیکن سالسٹ پر انگریزوں نے قبضہ جمالیا۔ اور اپنے دوست فتح سنگھ کو بھی بڑودہ کی گدی پر بٹھا دیا۔

نواب کرناٹک اور راجہ تنجور کے ساتھ زیادتی

انتہائی لوٹ کھسوٹ کے باوجود بھی آئے دن کی لڑائیوں کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی ہمیشہ دیوالیہ ہی رہتی تھی اور اس کے عمال کو روپے کی فراہمی کے لئے بدتر سے بدتر افعال کا مُرتکب ہونا پڑتا تھا۔ اس سے پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ حصولِ زر کے لئے راجہ بنارس اور بیگماتِ اودھ کے ساتھ کیسا ناروا سلوک کیا گیا۔ اور اب ہم کمپنی کے عمال کی اُن شائستہ حرکتوں پر روشنی ڈالتے ہیں جو انھوں نے نواب کرناٹک اور راجہ تنجور کے ساتھ محض حصول زر کے لئے کیں۔

نواب کرناٹک محمد علی انگریزوں کے ہاتھ بک چکا تھا۔ اُسے گورنر مدراس جس طرح چاہتا تھا نچاتا تھا اسی طرح اب کو جنگی مصارف یا امدادی فوج کے خرچ کے نام پر خوب لوٹا گیا۔ نواب نے فوج کے مصارف کیلئے ایک جاگیر بھی انگریزوں کو دیدی تھی۔ غرضکہ نواب ہر ممکن طریقہ سے انگریزوں کا گھر بھرتا رہتا تھا۔

مدراس کونسل کے انگریزوں کا جب اس سے بھی پیٹ نہیں بھرتا تھا تو نواب کمپنی کے ملازموں سے سود در سود پر روپیہ قرض لیتا تھا اور انگریزوں کو دیدیتا تھا۔ کمپنی کے سفید فام مہاجن جب اسے روپیہ قرض دیتے تھے تو کوئی نہ کوئی پرگنہ یا علاقہ رہن رکھ لیتے تھے۔ نواب کو قرض دینے والوں میں کمپنی کے ایک ادنیٰ ملازم "پال بین فیلڈ" کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو نوابوں جیسی زندگی گزارتا تھا۔ اور اپنے وقت کا کروڑپتی شمار ہوتا تھا۔

انگریزوں نے صرف نواب کرناٹک ہی کو نہیں لوٹا۔ بلکہ نواب کے باجگذار

راجہ تنجور کو بھی سالانہ خراج بڑھانے کے لئے نواب کے ذریعہ مجبور کرایا۔ جب راجہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوا تو اُسے بھی راجہ بنارس کی طرح معزول کر دیا گیا۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں سے جب راجہ نے اس ناروا سلوک کی شکایت کی تو ڈائرکٹروں نے اسے پھر بحال کر دیا۔ لیکن مدراس کونسل چونکہ راجہ کی مخالف ہوگئی تھی۔ اس لئے ڈائرکٹروں کی منظوری کے باوجود راجہ کو پھر کبھی تخت پر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ یہاں تک کہ جب مدراس کے نئے گورنر پگٹ نے راجہ کی زیادہ حمایت کی تو اُسے بھی مدراس کونسل نے قید کر دیا۔ اور وہ اسی حالت میں مر گیا۔

راجہ تنجور سے فارغ ہونے کے بعد مدراس کونسل اپنے اُس وفادار ازلی نواب کرناٹک محمد علی کی جانب خاص طور پر متوجہ ہوئی جس کی وفاشعاری کی طویل داستان ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں۔ انگریز جب مخالفت پر آمادہ ہوتا ہے تو وہ اگلے پچھلے تمام تعلقات کو یک قلم فراموش کر دیتا ہے۔ چنانچہ یکایک انگریزوں کی آنکھیں نواب کی طرف سے بدل گئیں۔

سنہ ۱۷۸۱ء میں انھوں نے نواب کو مجبور کر کے تمام ریاست کی مالگزاری وصول کرنے کا خود اختیار لے لیا۔ اور طے پایا کہ نواب کو صرف اُس کے مالیہ کا پانچواں حصہ دیا جائے گا۔ گویا پوری ریاست کرناٹک پر بالجبر قبضہ جما لیا گیا۔

انگریزوں کی ان دست درازیوں اور ابلہ فریبیوں سے اندازہ لگایئے کہ انگلستان کے ماہی گیروں نے دشمنوں کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے اُن دوستوں کے ساتھ جنہوں نے کہ ان کو ہندوستان کا بادشاہ بنایا تھا۔ کیسے کیسے ناروا سلوک کئے ہیں کیا دُنیا کی کسی تاریخ میں بھی محسن کشی کے ایسے ناپاک نمونے مل سکتے ہیں۔

انگریزوں کے خلاف حیدر علی نظام اور مرہٹوں کا محاذ

گذشتہ مرہٹہ جنگ جس میں محض

انگریزوں کی بدعہدی کی بنا پر حیدر علی کو شکست اور شدید نقصانات اُٹھانے پڑے تھے۔ اس نے حیدر علی کے دل میں انگریزوں کی طرف سے شدید نفرت پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ انگریزوں کی اس بدعہدی کے بعد سے حیدر علی نے اپنی طاقت کو خوب بڑھایا۔ مرہٹوں کی خانہ جنگی کے زمانہ میں جتنا علاقہ کھویا تھا۔ اُس سے زیادہ حاصل کر لیا، اور حیدر علی کی طاقت اس قدر بڑھ گئی کہ خود مرہٹوں کی پونا گورنمنٹ سلطان میسور سے اتحاد قائم کرنے پر مجبور ہو گئی۔

انگریزوں اور مرہٹوں کی پچھلی جنگ میں کیونکہ انگریزوں نے مرہٹہ حکومتوں کے غداروں سے سازباز کر کے مرہٹوں کو کافی پریشان کیا تھا۔ اس لئے مرہٹوں کے دلوں میں بھی انگریزوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کے علاوہ انگریزوں کی ابن الوقتی نے نظام حیدر آباد کو بھی بڑی حد تک اُن کا مخالف بنا دیا تھا۔ غرضکہ دکن کی یہ تینوں بڑی حکومتیں جو انگریزوں سے متنفر تھیں۔ انگریزوں کے خلاف متحد ہو گئیں۔ اور تینوں نے یہ معاہدہ کر لیا کہ ہم اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ جب تک کہ ان سفید فام غیر ملکیوں کو جو ہم کو آپس میں لڑا رہے ہیں ملک سے نہ نکال دیں گے۔

اسی زمانہ میں اتفاق سے انگلستان اور فرانس میں بھی جنگ چھڑ گئی۔ اور اس جنگ کے چھڑتے ہی انگریزوں نے فرانس کے ہندوستانی مقبوضات پر قبضہ کر کے فرانسیسیوں کو وہاں سے نکالنا شروع کر دیا۔ اور پانڈی چری کا محاصرہ کر کے انگریزوں نے اسے لے لیا۔ اور ماہی کی بندرگاہ پر بھی یہ قابض ہو گئے۔ حیدر علی جس کو قدرتی طور پر انگریزوں کے ہر ایک دشمن سے ہمدردی تھی۔ اُس نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھتے ہوئے فرانسیسیوں سے بھی انگریزوں کے خلاف جنگی معاہدہ کر لیا۔

ماہی چونکہ علاقہ میسور میں تھا۔ اس لئے انگریزوں کے ماہی پر قبضہ جمانے کے بعد حیدر علی کو بہانہ بھی ہاتھ آ گیا۔ حیدر علی نے پہلے ہی انگریزوں کو مطلع کر دیا تھا کہ اگر

ماہی پر فوج کشی کی گئی تو یہ فعل حکومتِ میسور پر براہ راست حملہ تصور کیا جائے گا۔
غرضکہ ماہی کے معاملہ پر انگریزوں اور حیدر علی میں ۱۷۸۰ء میں وہ تاریخی جنگ چھڑگئی جو دوسری جنگِ میسور کے نام سے مشہور ہے۔

نظام اور مرہٹوں کی بدعہدی

حیدر علی کے اس اچانک حملہ نے انگریزوں کو بوکھلا دیا۔ انگریز افسر سر ہکرٹ مزو نے پانچ ہزار فوج لے کر حیدر علی کا مقابلہ کیا۔ مگر اُسے بُری طرح شکست ہوئی۔ کرنیل بیلی جو تین ہزار فوج لے کر مقابلہ پر آیا تھا۔ وہ لڑے بغیر ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ اور گرفتار ہو گیا۔ منرو کسی نہ کسی طرح جان بچا کر نکل گیا۔ اور اس نے ہسٹنگز سے مدد طلب کی۔ ہسٹنگز نے فوراً حیدر علی کے خلاف سازش کا جال بچھانا شروع کر دیا۔

انگریز کا یہ پُرانا طریقہ کار ہے کہ جب وہ مردانہ وار مقابلہ نہیں کر سکتا تو عیارانہ سازش شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ ہسٹنگز نے انتہائی دجل اور مکر و فریب سے نظام اور مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ چنانچہ وہی مرہٹے اور نظام جو چند روز قبل انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے پر تلے ہوئے تھے۔ محبِ وطن حیدر علی سے غداری کر کے عین وقت پر علحدہ ہو گئے۔

مرہٹہ سردار بھونسلہ انگریزوں سے سولہ لاکھ روپے لے کر خاموش بیٹھ گیا۔ اور نظام حیدر آباد نے صرف یہی نہیں کیا کہ وہ جنگ میں شامل نہیں ہوا۔ بلکہ اپنے علاقہ سے انگریزی فوج کے گزرنے کی اجازت دے کر انگریزوں کو دوامی موت سے بچا لیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ انگریز قوم یورپ میں فرانسیسیوں سے برسرِ پیکار تھی۔ اگر حیدر علی کے ساتھ مرہٹوں اور نظام حیدر آباد نے بدعہدی نہ کی ہوتی تو ہندوستان سے انگریزی اقتدار شاید چند ماہ کے اندر اندر مٹ جاتا اور ہندوستان کی تاریخ موجودہ تاریخ سے بالکل مختلف ہوتی۔

جنوبی ہند کے انگریز حیدر علی سے لرزتے تھے اور اپنی تباہی اور موت سے خائف تھے۔ چنانچہ جب سر آئیر کوٹ کی سرکردگی میں بنگال سے فوج آگئی تو اُن کی ہمّت بندھی۔ حیدر علی نے اس فوج کو بھی ساحلِ سمندر پر گھیر لیا۔ لیکن فرانسیسی بیڑا جو مدد کے لئے آیا تھا واپس چلا گیا۔ اور انگریزوں کے لئے سمندر کی طرف سے رسد اور سامانِ جنگ کے بھیجنے کا راستہ کھل گیا۔ غرضکہ سر آئیر کوٹ کے مقابلہ میں اس معرکہ میں حیدر علی کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور اُسے ساحلِ سمندر سے ہٹ کر ملک کے اندرونی حصّہ کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔

ملک کے اندرونی علاقہ میں حیدر علی کی فوجوں کو تقریباً ہر جگہ انگریزوں پر غلبہ حاصل تھا۔ حیدر علی کی فوج نے سارے کرناٹک کو تاراج کر ڈالا تھا۔ ۱۷۸۲ء میں حیدر علی کے بیٹے ٹیپو کا تنجور کے قریب انگریزوں سے شدید مقابلہ ہوا جس میں ٹیپو کو فتح حاصل ہوئی۔ اس معرکہ میں ٹیپو نے دو ہزار انگریزوں کو کاٹ کے رکھ دیا۔ اسی دوران میں حیدر علی کی مدد کے لئے فرانسیسی بیڑا اور فوج بھی آگئی جس کا سپہ سالار بسے تھا۔

حیدر علی کی بے وقت موت

ایسی حالت میں جب کہ انگریز تباہی اور موت کے منہ میں پہنچ چکے تھے۔ انگریزوں کی یہ خوش بختی تھی کہ قبل اس کے کہ حیدر علی فرانس کی امداد سے فائدہ اُٹھاتا ۱۷۸۲ء میں اچانک اسی سال کی عمر میں اُس کا انتقال ہو گیا۔ حیدر علی کی موت کی وجہ سے ٹیپو سلطان کو مجبوراً اپنی تخت نشینی کے لئے دار السلطنت جانا پڑا۔ اور اس طرح انگریزوں کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ اس پر طرّہ یہ کہ چونکہ انگلستان اور فرانس میں صلح ہو گئی تھی اس لئے ہندوستان کی فرانسیسی فوج بھی سلطان میسور کی امداد سے کنارہ کش ہو گئی۔

سلطان ٹیپو تخت نشینی کی رسم سے فارغ ہوتے کے ساتھ ہی پھر انگریزوں کے مقابلہ پر آن ڈٹا اور ریاست بدنور پر قبضہ کر لیا۔ انگریز جرنیل میتھو نے ہتھیار ڈال دئے اور گرفتار

ہوگیا۔ اس کے بعد سلطان ٹیپو نے منگلور کا محاصرہ کرلیا۔ اسی جگہ انگریزی سفیر اُس کی خدمت میں صلح کے لئے آیا۔ سلطان ٹیپو نے منگلور فتح کرنے کے بعد انگریزوں کی صلح کی پیش کش قبول کرلی۔ چنانچہ مارچ ۱۷۸۴ء میں عہد نامہ منگلور کی رُو سے یہ طے ہوگیا کہ فریقین نے جو مقامات فتح کئے ہیں اُن سے دست کش ہو جائیں گے۔ اور دونوں طرف کے جنگی قیدی رہا کر دئے جائیں گے۔ غرضکہ نظام اور مرہٹوں کی بدعہدی۔ حیدر علی کی موت اور فرانس و انگلستان کی صلح نے انگریزوں کو بہت بڑی تباہی اور بربادی سے بچا لیا۔

ولیم پٹ کا انڈیا بل

وارن ہسٹنگز کے دورِ حکومت کے آخری دنوں میں انگلستان کے انصاف پسند حلقوں میں کمپنی کی ہندوستان میں ظالمانہ حرکتوں پر اچھا خاصہ طوفان برپا ہوگیا۔ اس طوفان کا بڑا باعث بیگمات اودھ کے ساتھ ظلم اور راجہ بنارس کے ساتھ ہسٹنگز کی منتقمانہ کارروائی تھی۔ غرضکہ انگلستان میں وارن ہسٹنگز اور کمپنی کے ملازموں کے خلاف اس قدر ہیجان برپا ہوا کہ پارلیمنٹ کو "ریگولیٹنگ ایکٹ" جیسے ناقص قانون کی بجائے "انڈیا بل" کے نام سے ایک نیا قانون پاس کرنا پڑا۔ یہ قانون اُس زمانہ کے انگلستان کے وزیراعظم ولیم پٹ نے ۱۷۸۴ء میں پیش کیا تھا۔ جو بغیر کسی دقت کے پاس ہوگیا۔

اس قانون کی رُو سے کمپنی کے اختیارات تاج برطانیہ کو سونپ دئے گئے انگلستان میں چھ ممبروں کا بورڈ آف کنٹرول قائم کر دیا گیا اور اس بورڈ کے صدر کو وزیر ہند کے اختیارات دیدئے گئے۔ ہندوستان میں گورنر جنرل کی جو کونسل تھی اُس کے ممبروں میں کمی کر کے چار کی بجائے تین کر دئے گئے اور گورنر جنرل کو خاص حالات میں کونسل کے فیصلہ کو مسترد کردینے کا حق دیدیا گیا۔ اس کے علاوہ گورنر کو خود اپنی ذمہ داری پر کسی لڑائی میں شامل ہونے یا صلح کرنے کا اختیار بھی مل گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی گورنر جنرل اور اُس کی کونسل کو ہدایت کردی گئی کہ چونکہ

برطانیہ کی پالیسی ہندوستان میں جدید فتوحات حاصل کرنا اور دیسیوں سے جنگ کرنا نہیں ہے۔ اس لئے حتی المقدور جنگ اور ملک گیری سے بچا جائے۔ اس قانون کے پاس ہونے کے بعد گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کا تقرر کمپنی کے زعما کے ہاتھ سے نکل کر تاج برطانیہ کے قبضہ میں چلا گیا۔

ہسٹنگز کے خلاف لندن میں مقدمہ

جنگ میسور کے خاتمہ کے چند ہی ماہ بعد چونکہ وارن ہسٹنگز کی میعاد ملازمت ختم ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ لندن واپس چلا گیا۔ ۱۷۸۵ء میں ہسٹنگز کے لندن پہنچنے پر اُس کے خلاف رائے عامہ نے اس قدر ہیجان برپا کیا کہ پارلیمنٹ اس کے خلاف مقدمہ قائم کرنے پر مجبور ہو گئی۔

ہسٹنگز کی بے عنوانیوں کے خلاف تقریباً بیس الزامات تھے جن کی صفائی کے لئے اُسے کامل سات سال تک عدالت کے کٹہرے میں کھڑا رہنا پڑا۔ آخر سات سال کے بعد ایوان خاص نے اُسے تمام عائد کردہ الزامات سے بری کر دیا لیکن دولت کا وہ انبار جو ہسٹنگز ناجائز ذرائع سے کما کر انگلستان لے گیا تھا۔ سب کا سب اس مقدمہ بازی پر برباد ہو گیا۔ اور اُس کی مالی حالت اس قدر ردی ہو گئی کہ حکومت کو اُس کی گذر اوقات کے لئے چار ہزار پونڈ سالانہ کا وظیفہ مقرر کرنا پڑا جو مرتے دم تک اُسے ملتا رہا۔

ہسٹنگز کے زمانہ ہی میں مدرسہ کلکتہ کی بنیاد پڑی۔ کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی قائم ہوئی اور اسی زمانہ میں پنڈتوں کی ایک جماعت نے ہندو قوانین کا مجموعہ تیار کیا تھا۔ ہسٹنگز مشرقی علوم و فنون کا بڑا دلدادہ تھا۔ کلایو کے بعد ہسٹنگز دوسرا شخص تھا جس نے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی تعمیر میں جائز و ناجائز ہر قسم کے وسائل اختیار کئے۔

لارڈ کارنوالس کا عہد حکومت

لارڈ کارنوالس کو ۱۷۸۶ء میں ہسٹنگز

کی جگہ ہندوستان میں برطانوی مقبوضات کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا تھا۔ یہ انگلستان کا بہت بڑا مدبر شمار کیا جاتا تھا۔ ہندوستان آنے سے قبل وہ زمانہ دراز تک امریکہ میں امریکنوں کی جنگِ آزادی کو دبانے کی ناکام کوشش کرتا رہا تھا۔ جب امریکہ میں وہ ناکام ہوا اور امریکہ انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو اُسے ہندوستان بھیجا گیا تاکہ وہ ہندوستان پہنچنے کے بعد اُس نقصان کی تلافی کر سکے۔ جو انگلستان کو امریکہ کے قبضے سے نکل جانے سے ہوا ہے۔

لندن پارلیمنٹ نے اگرچہ اپنی پالیسی کا اظہار کرتے ہوئے صاف الفاظ میں یہ کہدیا تھا کہ برطانیہ ہندوستان میں جدید فتوحات اور لڑائی جھگڑوں کا خواہشمند نہیں ہے لیکن لارڈ کارنوالس اور اُس کے جانشینوں کا طرزِ عمل یہ بتاتا ہے کہ برطانیہ کا یہ بیان محض دکھاوے کے لئے تھا۔ ورنہ حقیقت میں برطانیہ کی پالیسی یہی تھی کہ ہندوستان کو مکمل طریقہ پر فتح کرنے کے بعد اُسے اسکے حقیقی وارثوں اور مالکوں سے محروم کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ امریکہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد برطانیہ اس کا بدل تلاش کرنے پر مجبور بھی تھا۔

لارڈ کارنوالس نے ہندوستان آتے ہی ملک پر اندھا دھند قبضہ جمانے کی غلط پالیسی سے اجتناب کیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ لوٹ کھسوٹ کی پالیسی سے متنفر تھا بلکہ اس لئے کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ پہلے مفتوحہ علاقوں میں انگریز مستحکم ہو جائیں۔ اُس کے بعد آگے قدم بڑھایا جائے۔

لارڈ کارنوالس کی اصلاحات

لارڈ کارنوالس نے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی جدید اصلاحات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اِن اصلاحات کا مقصد یہ نہیں تھا کہ انگریزوں کے قدموں کی برکت سے ہندوستانیوں پر جو فاقہ کشی اور غربت مسلط ہو گئی تھی۔ اُسے

دُور کیا جائے۔ بلکہ اُس کا منشا یہ تھا کہ کمپنی کے خالی خزانہ کو بھرا جائے۔ سفید رنگ ملازمین کو رشوت ستانی اور بے ایمانی سے روکا جائے اور اُن کی تنخواہوں میں اس قدر اضافہ کردیا جائے تاکہ اُن کو رشوت ستانی اور بے ایمانی نہ کرنی پڑے۔

کارنوالس نے فوج کے انگریز عہدہ داروں کی تنخواہ میں نمایاں اضافہ کردیا ہندوستانیوں کو سول سروس سے محروم کردیا گیا۔ کارنوالس نے عدالتی انتظامات میں بھی اصلاحات کیں۔ عدالتی نظام کو بہتر بنایا۔ چھوٹی عدالتوں کے خلاف اپیل سُننے کے لئے چار بڑی عدالتیں۔ کلکتہ۔ ڈھاکہ مرشد آباد اور پٹنہ میں قائم کیں۔ نیا ضابطہ قوانین جاری کیا۔ ڈسٹرکٹ جج اور کلکٹر کے عہدوں کو الگ الگ کردیا غرضکہ کارنوالس کی عدالتی اصلاحات بھی محض اس مقصد کے لئے تھیں کہ برطانوی نظام حکومت کو ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ چُست بنایا جائے۔ تاکہ حکمرانی اور جدید فتوحات میں کوئی رُکاوٹ نہ پیدا ہوسکے۔

لارڈ کارنوالس نے حکومت کی آمدنی بڑھانے کے لئے "بندوبست استمراری" کا طریقہ رائج کیا یعنی ہسٹنگز کے زمانہ میں تو زمینوں کو دینے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ٹھیکہ پر دیجاتی تھیں یعنی جو بھی زیادہ بولی دیتا تھا اُسے اس زمین کا زمیندار قرار دیدیا جاتا تھا۔ لیکن کارنوالس نے یہ پُرانا طریقہ منسوخ کرکے زمین کے ٹھیکیداروں کو مقبوضہ زمینوں کا مستقل مالک یا زمیندار بنادیا۔ اور ایک مقررہ لگان مقرر کردیا۔ جس سے حکومت کی آمدنی بھی مستقل ہوگئی اور زمیندار بھی مطمئن ہوگئے

ٹیپو کے خلاف مرہٹوں اور نظام سے سازباز

وہی لارڈ کارنوالس جو اپنے ساتھ وہ "انڈیا بل" لایا تھا۔ جو امن پسندی کا چارٹر تھا۔ اور جس میں یہ کہا گیا تھا کہ برطانیہ ملک گیری نہیں چاہتا۔ اُسے جوں ہی ملک کے اندرونی انتظامات سے فرصت ملی۔ اُس نے

ملک گیری کے لئے جوڑ توڑ شروع کردیا یا بالفاظ دیگر انڈیا بل کی "امن پسندی" کی دھجیاں اڑانی شروع کردیں اور ٹیپو جیسے محبِ وطن کے کچلنے کے لئے وسیع پیمانہ پر تیاریاں ہونے لگیں۔

منگلور کے عہد نامے کے مطابق انگریز ٹیپو کو اپنا دوست قرار دے چکے تھے۔ اور وقتِ ضرورت فوجی امداد کا بھی وعدہ کر چکے تھے لیکن انگریزوں کو جب حالات سازگار دکھائی دئے اور انھوں نے محسوس کیا کہ ٹیپو جنگ کے لئے تیار نہیں ہے تو سارے عہد نامے ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گئے۔ چنانچہ انگریزوں نے ٹیپو کو بلا وجہ کچلنے کے لئے نظام دکن اور مرہٹہ سردار نانا فرنویس کو اپنے ساتھ ملا لیا اور یہ قرار پایا کہ ٹیپو کا جو ملک بھی فتح ہوگا اُسے تینوں اتحادی آپس میں بانٹ لیں گے۔ گویا کفن چوروں نے مال ہاتھ لگنے سے پہلے ہی بٹوارہ کر لیا۔

تمام معاملات جب طے ہو گئے تو ٹیپو کو ذلت آمیز خطوط لکھے گئے۔ اور طرح طرح سے بھڑکایا گیا تاکہ پہل کرنے کا الزام ٹیپو کے سر تھوپا جا سکے۔ ٹیپو جو لائق ترین سپہ سالار ہونے کے ساتھ بہترین مدبر بھی تھا۔ سب کچھ برداشت کرتا رہا کیونکہ وہ جنگ کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر کارنوالس جنگ کے لئے تلا ہوا تھا۔ اُسے امریکہ کی شکست اور ناکامی کا بدلہ ہندوستان اور اس کے محبِ وطن حکمرانوں سے لینا نہایت ضروری تھا۔

ٹیپو کو طرح طرح سے بھڑکا کر جنگ کے لئے اُبھارا گیا۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو انگریزوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ٹیپو ہمارے حلیف راجہ ٹراونکور پر حملہ کرنے والا ہے۔ ٹیپو نے جب اس کی بھی تردید کر دی تو یہ کہتے ہوئے کہ ٹیپو جھوٹا ہے جنرل میڈوز نے ایک دم ٹیپو پر یورش کر دی۔ مگر میڈوز کو اس محبِ وطن کے مقابلہ میں شکست ہو گئی۔ اس شکست کے بعد کارنوالس خود میدان میں آ گیا۔ نظام اور مرہٹوں کا لشکر اس محبِ وطن کا خون بہانے کیلئے کارنوالس کے دوش بدوش تھا۔ اتحادیوں نے بنگلور فتح

کرلیا۔ اور بنگلور کے باشندوں پر وہ ظلم ڈھائے جس کے تصور سے بھی کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ اس کے بعد تینوں اتحادی سرنگاپٹم کی جانب بڑھے اور اُس پر بھی قبضہ کرلیا۔ آخر ٹیپو کو مجبوراً نہایت ہی گری ہوئی شرطوں پر اتحادیوں سے صلح کرنی پڑی۔

محبِّ وطن ٹیپو کی طاقت کو ختم کردیا گیا

یہ صلح ۱۷۹۲ء میں سرنگاپٹم کے عہدنامہ کے مطابق ہوئی تھی۔ اسکی شرائط یہ تھیں "ٹیپو ریاست میسور کا نصف حصہ اتحادیوں کے حوالے کردے گا۔ تین کروڑ تیس ہزار تاوان جنگ دیگا۔ اور شرائط کی تکمیل ہونے تک ٹیپو کے بیٹے بطور یرغمال اتحادیوں کے قبضہ میں رہیں گے۔ غرضکہ میسور کی اس لوٹ میں مالابار۔ کورگ ڈنڈی گل اور بارہ محل کے اضلاع انگریزوں کے قبضہ میں آئے۔ میسور کا جنوب و مشرقی حصہ نظام کو ملا۔ اور میسور کا شمال و مغربی علاقہ مرہٹوں کے ہاتھ لگا۔

کفن چوروں نے ملک کی تقسیم اس طریقہ پر کی کہ ٹیپو کے بقیہ ملک کی سرحدیں سمندر سے دور ہو جائیں۔ تاکہ وہ آئندہ فرانس سے کوئی امداد حاصل نہ کرسکے مختصر یہ کہ شیر دکن ٹیپو کو لوہے کے پنجرے میں بند کردیا گیا۔ انگریزوں سے زیادہ اس محبِّ وطن کی تباہی میں نظام اور مرہٹوں کا ہاتھ تھا۔ تاریخ نظام اور مرہٹوں کی اِس غدّاری کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ اور جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا۔ نظام اور مرہٹوں کے دامن کا یہ شرمناک داغ اور بھی زیادہ اُبھرتا جائے گا۔

آپ نے دیکھا کہ کارنوالس جو امن اور آشتی کا پروانہ یعنی "انڈیا بل" لے کر آیا تھا۔ اُس نے امریکہ کے نقصان کی تلافی کے لئے کس بے دردی کے ساتھ ہندوستانی محبانِ وطن کا خون بہایا۔ اور صرف اس جرم میں کہ ٹیپو کا کوئی جرم نہ تھا۔ کس طرح اُسے بے دست و پا کردیا اور لطف یہ ہے کہ وزارتِ انگلستان

اُس کی ان غیر آئینی حرکات میں ہر قسم کی مدد کرتی رہی۔

کارنوالس نے اپنے دورِ حکومت میں برطانوی مقبوضات کے نظام حکومت کو نہایت ہی چُست بنا دیا تھا اس نے بندوبست دوامی یا استمراری کے ذریعہ کمپنی کی مالی حالت کو سدھارا سفید فام قوم کے لئے آئینی اصلاحات کیں۔ اور انگریزوں کو ہندوستان میں اس قدر مضبوط بنا دیا کہ وہ زمانہ دراز تک بے فکری کے ساتھ ہندوستان پر حکمرانی کرتے رہے۔ غرضکہ کارنوالس کا سات سالہ دورِ حکومت، جہاں ہندوستانیوں کے لئے غلامی کا پیغام تھا۔ وہاں برطانیہ کے لئے خوش بختی کا ایک مژدہ جانفزا تھا۔

سر جان شور کا دورِ حکومت

انگریز مورخوں نے سر جان شور کو عدم تشدد کا دیوتا قرار دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سر جان شور نے سابق گورنروں اور گورنر جنرلوں کی طرح کسی ہندوستانی ریاست کے خلاف فوج کشی نہیں کی لیکن اُس کی اور اس کے پیشروؤں کی پالیسی میں ذرہ برابر بھی فرق نہ تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اس اُصول پر عامل تھا۔ کہ جہاں گُڑ سے مارا جا سکتا ہو وہاں زہر کا استعمال حماقت ہے۔ سر جان شور کے ۱۷۹۳ء میں ہندوستان آ نکلے بعد یہاں جو حالات و واقعات رُونما ہو رہے تھے۔ سر جان شور خاموش بیٹھا ہوا اُن کا مطالعہ کرتا رہا۔

مادھو جی سندھیا جو دہلی اور شمالی ہند پر چھایا ہوا تھا اور جس نے اپنی طاقت کے بل پر مادھو راؤ ثانی کو پونا کی گدی پر بٹھا کر نانا فرنویس کو نکلوا دیا تھا۔ اچانک ۱۷۹۴ء میں مر گیا۔ اُس کے مرتے ہی پونا کی مرکزی مرہٹہ ریاست پھر نانا فرنویس کے ہاتھ میں آ گئی۔ سندھیا کے مرنے کے بعد اب سب سے بڑی مرہٹہ طاقت نانا فرنویس کے ہاتھ میں تھی۔ نانا فرنویس نے اس طاقت کے بل پر نظام کو دھمکانا شروع کیا۔ اور نظام سے چوتھ کی رقم طلب کی۔ جب نظام اس کے لئے تیار نہ ہوا تو مرہٹے

لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

انگریزوں کی نظام سے بدعہدی

نظام الملک اور انگریزوں میں یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ اگر کوئی تیسری طاقت ان میں سے کسی پر بھی حملہ کرے گی تو دونوں ایک دوسرے کی مدد کریں گے لیکن نظام یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جب اُس نے انگریزوں سے سابقہ معاہدہ کے مطابق مرہٹوں کے مقابلہ میں امداد طلب کی تو انگریزوں نے صاف انکار کر دیا۔ انگریزوں کا یہ سلوک اُس نظام کے ساتھ تھا جس نے کہ محبِّ وطن حیدر علی کے ساتھ انگریزوں کی خاطر غدّاری کی تھی جس نے اپنی تلوار سے ٹیپو جیسے حریت پرست کے گھر میں خون کی ندیاں بہا دی تھیں۔ اور ٹیپو کی ریاست کو انگریزوں کو خوش کرنے کی خاطر فنا کر کے رکھ دیا تھا۔

انگریزوں کے اس انکار پر نظام بے یار و مددگار رہ گیا۔ چنانچہ جب مرہٹہ سرداروں نے نانا فرنویس کی سرکردگی میں متحد ہو کر پوری طاقت کے ساتھ نظام پر حملہ کیا۔ تو نظام کے سپاہی مقابلہ کی تاب نہ لا کر میدان سے فرار ہو گئے۔ اور نظام کو مجبوراً کرڑلا کے قلعہ میں پناہ لینی پڑی۔ جب مرہٹوں نے اس قلعہ کو بھی محصور کر لیا تو نظام کو ہتھیار ڈالنے کے بعد مرہٹوں کی منہ بولی شرطوں پر صلح کرنی پڑی جن کی رُو سے نظام کو تین کروڑ روپیہ مرہٹوں کو دینا پڑا۔ اور بہت سے اضلاع بھی مرہٹوں کی نذر کر دینے پڑے۔ سر جان شور خوش تھا کہ دکن کی ایک بڑی طاقت دوسری طاقت کے ذریعہ سے بے جان ہو گئی۔ اور اُسے ایک گولی بھی نہ چلانی پڑی۔ آپ نے دیکھا کہ سر جان شور نے عدمِ مداخلت یا بدعہدی کی پالیسی سے کیسا زبردست فائدہ اُٹھایا۔

مرہٹہ طاقت کا زوال

نظام پر فتح حاصل کرنے کے بعد گو نانا فرنویس

کا مرہٹوں میں اقتدار بے حد بڑھ گیا تھا۔ لیکن مادھو راؤ پیشوا اُس سے بدظن ہو چکا تھا وہ چاہتا تھا کہ اس بوڑھے اتالیق اور وزیرِ اعظم کو نکال دے۔ مگر بوڑھے فرنویس نے جب اپنی گرفت اور مضبوط کر دی تو مادھو راؤ پیشوا نے نانا فرنویس سے تنگ آکر چھت سے کود کر خودکشی کر لی۔ پیشوا کے خودکشی کرتے ہی مرہٹوں میں نانا فرنویس کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن نانا فرنویس نے طاقت سے اپنے سب مخالفوں کو دبا دیا۔ اور ۱۷۹۶ء میں باجی راؤ ثانی کو پیشوا کی گدی پر لا بٹھایا۔

باجی راؤ بڑا چلتا پُرزہ تھا۔ اس نے نانا فرنویس اور سندھیا کو آپس میں لڑا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوان سندھیا نے بوڑھے فرنویس کو بھی گرفتار کر لیا۔ اور پونا پر بھی اُس کا تسلط ہو گیا۔ غرضکہ مرہٹوں کی اس گروہ بندی اور خانہ جنگی سے مرہٹہ قوم میں بُری طرح انتشار پھیل گیا۔ ان کی فوجوں میں مرہٹوں کی بجائے عرب پٹھان اور راجپوت دکھائی دینے لگے۔ وہی مرہٹے جو دہلی سے لیکر مالوہ۔ گجرات اور دکن تک پھیلے ہوئے تھے۔ آپس کی خانہ جنگی کی بدولت اُن کی سیاسی حیثیت اور اہمیت بالکل گر گئی سر جان شور خوش تھا کہ دکن اور ہندوستان کی ایک اتنی بہت بڑی طاقت خانہ جنگی کا شکار ہو گئی۔ یہ ناممکن ہے کہ سر جان شور نے اس خانہ جنگی کی آگ کو ہوا دینے میں حصہ نہ لیا ہو، بہت ممکن ہے کہ یہ سب کچھ اُسی کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہو۔

اودھ کی نوابی کا جھگڑا

۱۷۹۷ء میں نواب آصف الدولہ کے مرنے کے بعد اُس کا بیٹا نواب وزیر علی گدی پر بیٹھا لیکن ایک دوسرا گروہ مرحوم آصف الدولہ کے بھائی نواب سعادت علی خاں کے حق میں تھا۔ نواب وزیر علی چونکہ آصف الدولہ کا بیٹا تھا۔ اس لئے اُس کے مسند نشین ہو جانے کے بعد کسی دوسرے دعویدار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لیکن وزیر علی میں ایک ایسی خرابی تھی جسے انگریز کبھی برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے یعنی وہ ابتدا ہی سے انگریزی

اقتدار کا دشمن تھا۔ بھلا یہ گناہ کیسے مُعاف کیا جا سکتا تھا۔

اودھ کی گدّی پر وزیر علی کے بیٹھنے کے بعد جب سعادت علی خاں کے حامیوں نے نواب وزیر علی کو "حرامی بچّہ" مشہور کرنا شروع کیا تو عدم مداخلت کے سب سے بڑے مُدعی سر جان شور کی "شرافت" نے بھی کروٹ لی۔ بھلا یہ اصحیح النسب انگریز مجہول النسب وزیر علی کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ چنانچہ سر جان شور کی مداخلت سے وزیر علی کو تخت سے اُتار کر سعادت علی خاں کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اور اُس سے ایک نئے معاہدے پر دستخط لے لئے گئے جس کی رُو سے الہ آباد کا قلعہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ اور فوجی مصارف کے نام پر جو روپیہ ریاست ادا کرتی تھی۔ اُسے بھی بڑھا کر ۷۶ لاکھ کر دیا گیا۔

سر جان شور نے اس طرح نہایت خاموشی کے ساتھ ریاست اودھ کی جان نکال لی۔ بے چارہ وزیر علی جو اودھ کی حکومت کا جائز وارث تھا۔ پہلے تو پہاڑوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ اور پھر اُسے اپنی بقیہ زندگی سر جان شور کی عنایت سے کلکتہ کے قید خانہ میں گزارنی پڑی۔ یعنی سر جان شور کی عدم مداخلت کی پالیسی فوج کشی کی پالیسی سے بھی زیادہ ہندوستانیوں کے لئے تباہ کُن ثابت ہوئی۔ غرضکہ اس گورنر جنرل کے دَور میں نظام مرہٹے اور اودھ یعنی یہ تینوں بڑی طاقتیں تقریباً ختم ہوگئیں۔

لارڈ ویلزلی کا دورِ حکومت

لارڈ ویلزلی کا دورِ حکومت ہندوستان کی برطانوی تاریخ کا تاریک ترین دور ہے۔ جس میں کہ انتہائی مکاری دجل اور فریب کے ذریعہ ہندوستان کی تقریباً تمام طاقتوں کو مٹا کر رکھ دیا گیا۔ یہ گورنر جنرل ۱۷۹۸ء میں ہندوستان آیا۔ اور ۱۸۰۵ء تک اس ملک میں جھر بن کر رہا۔ ویلزلی عیّاری اور مکاری میں کس طرح اپنے پیشرو گورنر جنرلوں سے کئی جُوتے آگے تھا۔ اس کا اندازہ اس گورنر جنرل کی اُن فریب کارانہ تباہکاریوں سے ہو جائے گا۔ جن کی مختصر سرگذشت ہم پیش کرنیوالے ہیں۔

ویلزلی اور اُس کے پیشرو یہ سمجھ چکے تھے کہ اگر ہندوستان میں اُن کا کوئی سب سے بڑا دشمن ہے تو وہ سلطان میسور ٹیپو ہے۔ ٹیپو بے نظیر سپہ سالار اور مدبر ہونے کے ساتھ ہی غیر ممالک سے بھی رابطے قائم کرنے کے فن سے آشنا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے سفیر بھیج کر انگریزوں کے دشمن ازلی فرانسیسیوں سے رابطۂ اتحاد جوڑ لیا تھا۔

انگریزوں کو اگرچہ اس چیز پر اطمینان تھا کہ انھوں نے ۱۷۹۲ء کی تیسری جنگ میسور میں نظام اور مرہٹوں کی وطن سے غداری کے طفیل میں ٹیپو کو بے دست و پا کر دیا ہے اور اُس سے تمام ساحلی علاقے چھین لئے ہیں تاکہ فرانسیسی بیڑا اُس کی مدد کے لئے اُس تک نہ پہنچ سکے لیکن پھر بھی انگریز اس شیرِ میسور کے نام سے کانپتے تھے اور اُن کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو ہندوستان کے اس محبِّ وطن کو جلد سے جلد ختم کر دیا جائے۔ ٹیپو اگرچہ بے دست و پا ہو چکا تھا مگر پھر بھی انگریزوں کو اس شیرِ میسور پر تنہا ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ اس کوشش میں تھے کہ جنوبی ہند کی دوسری طاقتوں کو ٹیپو کے خلاف کسی نہ کسی طرح متحد کر لیں لیکن ویلزلی کے لئے یہ پریشانی درپیش تھی کہ سر جان شور نے نظام سے بدعہدی کر کے نظام کی ہمدردی کھو دی تھی۔ مرہٹوں پر ویلزلی کو نہ تو اعتماد تھا اور نہ ان میں پہلی سی قوت باقی رہی تھی۔ لیکن پھر بھی اُنھیں ٹیپو کے مقابلہ میں ہندوستان کی دوسری طاقتوں کو اپنے ساتھ ملانا ضروری تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک نئی ترکیب یہ سوچی کہ انگریز فوج کو امداد اور حفاظت کے بہانے سے دیسی ریاستوں میں گھسا دیا جائے۔ اس طریقہ کار کا نام اُنھوں نے سب سیڈیری سسٹم رکھا۔

سب سیڈیری سسٹم کیا بلا ہے

سب سیڈیری سسٹم انگریز دماغ کی وہ اختراع تھی جس کے ذریعہ سبز باغ دکھا کر ہندوستانی ریاستوں اور ہندوستانی حکمرانوں کے گلے میں

دائمی غلاموں کا طوق ڈالنا مقصود تھا۔ چنانچہ سب سیڈیری سسٹم قبول کرنے والوں کو مندرجۂ ذیل باتوں کا پابند ہونا پڑتا تھا۔

(۱) سب سیڈیری سسٹم کے ذریعہ گورہ فوج گرانقدر کرایہ پردیسی فرمانرواؤں کو اُن کی حفاظت کے نام پر دی جاتی تھی۔

(۲) اس سسٹم قبول کرنے والی ریاست کو اپنی حکومت میں دیسی فوج گھٹا کر لازمی طور پر گورہ فوج رکھنی پڑتی تھی۔ اور اس کے گراں قدر اخراجات ادا کرنے پڑتے تھے۔

(۳) اگر کوئی ریاست گورہ فوج کے کرایہ کا روپیہ نہ ادا کر سکتی تھی تو ازراہ عنایت اس ریاست کے علاقے روپیہ کے بدلے میں انگریز قبول کر لیتے تھے۔

(۴) سسٹم قبول کرنے والی دو یا دو سے زیادہ ریاستوں میں اگر جنگ چھڑ جاتی تھی تو کمپنی ثالث کے فرائض انجام دیتی تھی۔ یعنی بندر بانٹ کے اصول پر عامل ہوتی تھی۔

(۵) سسٹم میں داخل ہونے والی ریاست کو دوسری ریاستوں یا ممالک سے رابطہ قائم کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا تھا۔ یعنی خارجی پالیسی پر اس کا اختیار نہ رہتا تھا۔ نیز وہ انگریزوں کے علاوہ کسی یورپین کو ملازم رکھنے کی بھی مجاز نہ تھی۔ اس کے علاوہ اُسے اپنے دربار میں کمپنی کا انگریز ریزیڈنٹ رکھنا ہوتا تھا۔ جو ریاست کے نگراں کے فرائض انجام دیتا تھا۔

(۶) کمپنی کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ سسٹم قبول کرنے والی ریاستوں کو فوجی مدد دے۔ اُن کے آپس کے جھگڑے چکائے۔ بیرونی حملوں اور اندرونی بغاوتوں سے انھیں بچائے۔ اور اُن کی سرپرست بن کر معاملات طے کرے۔ گویا سپریم پاور کمپنی بن گئی تھی۔

ویلزلی نے اس دستاویز فریب کے مرتب کرنے کے بعد ٹیپو کو اس میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ تو ٹیپو بھلا اس جال میں کب پھنسنے والا تھا۔ چنانچہ اُس نے صاف الفاظ میں اس طوق غلامی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ٹیپو کے علاوہ ویلزلی نے دوسرے متعدد حکمرانوں کو بھی سب سیڈیری سسٹم کی پُر فریب اسکیم قبول کرنے کے لئے دعوت دی تھی۔ لیکن اس اسکیم کی دفعات چونکہ بے حد سخت تھیں اس لئے خوشی کے ساتھ کوئی بھی اسے قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ آخر ویلزلی نے طاقت کے ذریعہ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کا تہیہ کر لیا۔

نظام سب سیڈیری سسٹم کا پہلا غلام

نظام جس کو انگریزوں کی بد عہدی کی وجہ سے مرہٹوں کے ہاتھوں شدید نقصان پہنچ چکا تھا۔ گو اُس نے بہت سے علاقے اس مدت میں واپس لے کر بڑی حد تک گذشتہ نقصان کی تلافی کر لی تھی لیکن اس کا دل انگریزوں سے صاف نہیں تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی ریاست میں فرانسیسی افسروں کی تعداد بڑھا لی تھی جو نظام کی فوجوں کو جدید جنگی اُصولوں کے مطابق تربیت دے رہے تھے۔ ویلزلی نے نظام کی یہ بدلی ہوئی روش دیکھی تو اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ نظام کو محبت سے نہیں بلکہ سنگین کی نوک سے جھکایا جائے۔ چنانچہ ایک بہت بڑی فوج نظام کے علاقہ میں داخل کر دی گئی۔ اور نظام کی چھاتی پر خنجر رکھ کر اُسے مجبور کیا گیا۔ کہ وہ سب سیڈیری سسٹم کا طوق غلامی اپنی گردن میں ڈال لے اور فرانسیسیوں کو فوراً اپنے علاقے سے نکال دے۔ غرضکہ نظام جس میں اب انگریزوں کے کسی بدتر سے بدتر مطالبہ کے ٹھکرانے کی بھی طاقت باقی نہیں رہی تھی۔ اور جو مرہٹوں سے بھی ڈرا بیٹھا تھا۔ اُس نے سب سیڈیری سسٹم کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا۔ یعنی نظام ہی وہ پہلا حکمران تھا جو جان بوجھ کر

انگریزوں کے چوہے دان میں پھنس گیا۔ چنانچہ اُس نے وزیر علی کی طرح معزول ہونے اور قید خانہ میں پڑنے کی بجائے انگریزوں کی غلامی کو لبیک کہا۔ ویلزلی خوش تھا کہ اُس کی پُر فریب اسکیم کامیاب ہونے لگی۔ اُس نے دوسری طاقتوں کو پھر ایک بار اس دجل اور فریب میں پھنس جانے کی دعوت دی۔ لیکن اُسے فوری طور پر کسی اور طرف سے کوئی اُمید افزا جواب نہ ملا۔

شیرِ میسور ٹیپو کا جہادِ آزادی

نظام کی جانب سے مطمئن ہونے کے بعد اب ویلزلی نے محبِ وطن ٹیپو سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ سلطان ٹیپو نے اگرچہ ویلزلی کی پُر فریب اسکیم کو ٹھکرا دیا تھا۔ لیکن ویلزلی بزعم خود یہ سمجھنے لگا تھا کہ اب ہندوستان کا ہر حکمران اُس کا غلام بن چکا ہے۔ چنانچہ اُس نے ٹیپو سے جواب طلب کیا کہ وہ فرانس اور دیگر ممالک سے کیوں ساز باز کر رہا ہے اور اُن سے کیوں تعلقات رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ٹیپو انگریز کا غلام نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی ٹیپو نے نہایت معقول جواب دیا۔ مگر یہ جواب ویلزلی کو کب مطمئن کر سکتا تھا۔

ٹیپو نے فرانسیسیوں سے بڑے گہرے تعلقات پیدا کر لئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انقلاب فرانس کے بعد نپولین ملک پر ملک فتح کرتا ہوا مصر تک پہنچ چکا تھا۔ ٹیپو سے اس کا معاہدہ ہو چکا تھا کہ وہ ہندوستان آ کر انگریزوں کے غلامی سے ہندوستانی حکمرانوں کو آزاد کرائے گا۔ بہت سے فرانسیسی افسر اس مقصد کے لئے میسور بھی پہنچ چکے تھے۔ اُسے نپولین کے سہارے کی اس لئے اور بھی ضرورت ہوئی کیونکہ نظام۔ مرہٹے اور ہندوستانی حکمران بار بار اُس کے ساتھ غداری کر چکے تھے۔ ٹیپو نے منگلور کی بندرگاہ پر ایک جنگی بیڑا بھی تیار کر رکھا تھا۔ تاکہ وقتِ ضرورت اس بیڑے سے بھی مدد لی جا سکے۔ غرضکہ مفلوج ہونے کے باوجود بھی

جہاں تک ممکن تھا۔ ٹیپو نے اپنی فوجی طاقت کو زیادہ سے زیادہ بڑھا لیا تھا۔

ٹیپو نے صرف نپولین ہی کو ہندوستان کی آزادی کے لئے دعوت نہیں دی تھی۔ بلکہ سلطان ٹرکی، شاہ افغانستان اور شاہ ایران کو بھی مکتوبات بھیج کر اس جنگِ آزادی میں حصہ لینے کے لئے بُلایا تھا۔ چنانچہ شاہِ افغانستان زماں شاہ ٹیپو کی مدد کے لئے اور ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے روانہ بھی ہو گیا تھا۔ لیکن ویلزلی نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ افغانستان میں خانہ جنگی برپا کرا دی تاکہ زماں شاہ اس خانہ جنگی میں پھنس کر رہ جائے۔

زماں شاہ ٹیپو کی مدد کے لئے جب لاہور پہنچا تو اُسے اطلاع ملی کہ اُس کے بھائی محمود نے والئ ایران کی مدد سے ہرات پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ ویلزلی کی فتنہ پردازیوں کی بدولت لاہور سے افغانستان لوٹ جانے پر مجبور ہو گیا۔ جب افغانستان پہنچا تو بھائی کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ زماں شاہ کو پکڑ کر اندھا کر دیا گیا۔ محض اس جرم میں کہ وہ مظلوم ہندوستانیوں کی مدد کے لئے کیوں گیا۔ دیکھا آپ نے کہ ہندوستان کو غلام رکھنے کے لئے انگریزوں کے دجل و فریب کے ہاتھ کتنی دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔

انگریزوں کے ہاتھوں مجاہدِ حریت ٹیپو کا خون

اپنے وطن کی آزادی کے لئے ٹیپو کی یہ جدوجہد ویلزلی کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ ویلزلی نے سمجھ لیا تھا کہ اگر ٹیپو کے معاملہ میں ذرا بھی تاخیر سے کام لیا گیا تو پھر انگریزوں کو ہندوستان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ چنانچہ ۱۷۹۹ء میں اس مجاہدِ حریت کو کچلنے کے لئے گورہ فوج میسور کی سرحد میں داخل ہو گئی۔

نظام کی بیس ہزار فوج بھی اُس کے بیٹے کے زیرکمان انگریزوں کے دوش بدوش

ٹیپو کے کچلنے کے لئے آگے بڑھ رہی تھی۔ نظام کا بیٹا تو اس فوج کا برائے نام کمانڈر تھا۔ حقیقت میں اس فوج کی کمان بھی انگریزوں ہی کے ہاتھ میں تھی یعنی لارڈ ویلزلی کا بھائی کرنل ویلزلی نظام کی اس فوج کی کمان کر رہا تھا۔

مکر و فریب اور حق و صداقت میں خوفناک جنگ چھڑ گئی۔ ٹیپو وطن کی ایک ایک انچ زمین کے لئے لڑا۔ اُس کے ساتھیوں نے پانی کی طرح خون بہایا۔ ایک طرف تن تنہا ٹیپو تھا اور دوسری طرف کرنل ویلزلی۔ جنرل ہیرس جنرل اسٹورٹ اور نظام کی متحدہ فوجیں تھیں۔ انگریزوں نے ٹیپو کو چاروں طرف سے سرنگاپٹم میں گھیر لیا۔ سلطان قلعہ میں محصور ہو گیا۔ قلعہ کو انگریزی توپوں نے بم باری سے اُڑا دیا۔ گورہ فوج قلعہ میں گھس گئی۔ شیر میسور ٹیپو نے شدید مقابلہ کیا۔ اور لڑتے ہوئے وطن کی آزادی کے لئے جان دیدی۔

ویلزلی جب قلعہ میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ ایک مجاہد حریت کی لاش پڑی ہے جس پر کہ اَن گنت زخم ہیں اور اُس کے زخموں سے بہنے والا تازہ خون یہ کہہ رہا ہے کہ شہیدانِ وطن کی قربانیاں کبھی رائگاں نہیں جاتیں۔

ٹیپو کا خاندانِ ریاست میسور سے محروم

ویلزلی نے محبِ وطن ٹیپو کی شہادت کے بعد ایک اور کاری ضرب لگائی۔ ٹیپو کے خاندان کو میسور کی حکمرانی سے محروم کر دیا گیا اور سابق ہندو راجہ کے خاندان کے کسی ایسے فرد کی تلاش شروع کی گئی جس کو انگریز جس طرح چاہیں کٹھ پتلی بنا کر نچا سکیں۔ بمشکل تمام ایک پانچ سالہ لڑکا دستیاب ہو سکا جسے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ لارڈ ویلزلی نے اپنے بھائی کرنل ویلزلی کو میسور کا گورنر بنا دیا۔ گویا ٹیپو کی سلطنت ویلزلی کے بھائی کے حوالے ہو گئی۔ اور ریاست کے انتظام کے لئے انگریز کونسل قائم کر دی گئی۔

ریاستِ میسور کے وہ شمالی علاقے جو نظام کی حکومت سے ملتے تھے محبِ وطن ٹیپو سے غداری کے انعام میں نظام کو عطا ہوئے۔ اور جنوب کے وہ علاقے جو ساحل سمندر کے قریب تھے کمپنی کی مملکت میں شامل کر لئے گئے غرضیکہ میسور کی ریاست کانٹ چھانٹ کر سرنگاپٹم اور اُس کے گرد و پیش کے چند علاقوں تک محدود کر دی گئی۔ اور اس پر بھی ویلزلی کا بھائی گورنر کی حیثیت سے قابض تھا۔ ویلزلی جس کا اصلی نام "لارڈ مورنگٹن" تھا۔ اس کو ہندوستانی محبانِ وطن کو کچلنے کے صلہ میں حکومتِ برطانیہ کی طرف سے "مارکوئس آف ویلزلی" کا خطاب عطا ہوا۔

نظام سے علاقے چھین لئے گئے

انگریزوں کو دکن کے تمام چھوٹے بڑے حکمرانوں کی محض اس لئے خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ کیونکہ انھیں ہر لمحہ یہ اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں یہ سلطان ٹیپو سے نہ مل جائیں لیکن اب جبکہ شہیدِ وطن ٹیپو دُنیا میں نہیں تھا۔ اور اُس کی ریاستِ میسور انگریزوں کے قبضہ میں آچکی تھی تو دکن کے حکمرانوں کے معاملہ میں انگریزوں کا رویہ بالکل تبدیل ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے اپنے پُرانے یارِ وفادار نظام دکن پر ہاتھ صاف کیا۔

ویلزلی نے نظام الملک کو بالکل مفلوج بنا دینے کے لئے ۱۸۰۰ء میں ایک نئے معاہدہ پر اُس سے دستخط کرا لئے جس کی رُو سے انگریزی فوج متعینہ حیدر آباد کی تعداد بڑھا دی گئی اور اُس کے مصارف کے لئے میسور کے وہ تمام علاقے کمپنی نے نظام سے واپس لے لئے جو ۱۷۹۲ء اور ۱۷۹۹ء میں سلطنت میسور کی تقسیم کے وقت سلطان میسور سے غداری کرنے کے انعام میں نظام کو دئے گئے تھے کس قدر قابلِ رحم تھی نظام کی حالت کہ

اُس نے وطن کے ساتھ غداری بھی کی اور اُسے کچھ نہ ملا۔ بلکہ وہ اُلٹا انگریزوں کا غلام در غلام بن گیا۔

کرناٹک اور تنجور پر انگریزوں کا کامل قبضہ

محمد علی کا بیٹا عمدۃ الامرا جو باپ کے مرنے کے بعد ۱۷۹۵ء میں تخت پر بیٹھا تھا۔ اگرچہ کرناٹک کا برائے نام نواب تھا۔ لیکن انگریز اب اسے ایک آنکھ دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ نواب کرناٹک انگریزوں کا وہ محسنِ اعظم تھا جس نے کہ ایسے نازک وقت میں انگریزوں کو سہارا دیا تھا جبکہ انگریزوں کیلئے ہندوستان میں رہنا ناممکن ہوگیا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ نواب کرناٹک ہی کی مدد سے انگریزوں نے کرناٹک میں قدم جمانے کے بعد بنگال کی جانب رُخ کیا۔ اور پھر ہندوستان کے اکثر وبیشتر علاقوں پر چھا گئے۔ غرضکہ وہ نواب کرناٹک جس کے طفیل میں انگریزوں کو ہندوستان میں بادشاہی کے اختیارات حاصل ہوئے تھے۔ انگریزوں نے محسن کشی کا شاندار ثبوت دیتے ہوئے اُس کے جانشین اور اولاد کو یک قلم کرناٹک سے نکالنے کے لئے جوڑ توڑ شروع کردیا۔

نواب کرناٹک یعنی عمدۃ الامرا کو تخت و تاج سے محروم کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرنا ضروری تھا۔ اسلئے اس پر الزام یہ لگایا گیا کہ اس نے میسور کی آخری جنگ میں ٹیپو سے سازباز کر رکھی تھی مگر نواب عمدۃ الامرا نے ان بے بنیاد الزامات کی پُرزور الفاظ میں تردید کردی۔

یہ جھگڑا چل ہی رہا تھا کہ ۱۸۰۱ء میں عمدۃ الامرا فوت ہوگیا۔ ویلزلی نے نواب کے مرنے پر اُس کے بیٹے علی حسین پر زور دیا کہ وہ نوابی کا برائے نام خطاب اور انگریزوں سے سالانہ وظیفہ لینے کے بعد تخت و تاج سے دستبردار ہو جائے۔ علی حسین نے ویلزلی کے جبر کے سامنے گردن جھکانے سے انکار کیا۔ تو ویلزلی نے زبردستی اُسے تخت و تاج

سے محروم کر دیا۔ اور اس کے ایک رشتہ دار عظیم الدولہ کو نوابان کرناٹک کا جانشین قرار دے کر ریاست سے دستبردار ی کا پروانا لکھوالیا۔ اور معمولی سا وظیفہ اس کے لئے مقرر کر دیا۔ غرضکہ ویلزلی نے انتہائی بددیانتی سے کام لیتے ہوئے کرناٹک کو ۱۸۰۱ء میں کمپنی کے مقبوضات میں شامل کرلیا۔

کرناٹک کو ہضم کرنے کے بعد ویلزلی نے ریاست تنجور کی جانب رُخ کیا۔ اس ریاست کے دو دعویداروں میں گدی کے لئے جھگڑا چل رہا تھا۔ انگریزوں کے لئے یہ بہترین موقعہ تھا۔ انھوں نے دونوں کا وظیفہ مقرر کر کے ریاست سے خارج کر دیا اور اس علاقہ پر بھی قبضہ جمالیا۔

اودھ کا آدھا ملک بھی ہضم

جنوبی ہند کی حکومتوں کو ختم اور مفلوج کرنے کے بعد ویلزلی نے شمالی ہند کی جانب توجہ فرمائی۔ اس کی نظر انتخاب سب سے پہلے اس نواب اودھ پر پڑی جو انگریزوں کا ازلی وفادار تھا اور جس نے بنگال و بہار میں انگریزوں کے پاؤں جمانے میں وطن سے غداری کرتے ہوئے انگریزوں کو ہر ممکن امداد دی تھی۔ چنانچہ اس نواب کو ویلزلی نے سب سیڈیری سسٹم قبول کرنے اور ریاست میں انگریزی فوجوں کو بڑھانے کا حکم دیدیا۔

نواب میں بھلا کیا طاقت تھی کہ وہ اپنے سفید فام آقا کے حکم سے سرتابی کرسکتا۔ چنانچہ ۱۸۰۱ء میں انگریزوں کا نواب اودھ سے ایک نیا معاہدہ ہو گیا جس کی رُو سے گورا فوج ریاست میں بڑھادی گئی اور اس کے اخراجات کے معاوضہ میں نواب کو اپنا آدھا ملک کمپنی کے حوالے کر دینا پڑا۔ غرضکہ اس طرح دوآب اور روہیلکھنڈ کے اضلاع بھی انگریزوں کے قبضے میں آگئے۔

باجی راؤ پیشوا انگریزوں کی پناہ میں

نانا فرنویس جب تک زندہ رہا انگریزوں کی دسیسہ کاریاں

مرہٹوں میں کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوسکیں۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ نانا فرنویس کو انگریزوں سے دلی نفرت تھی لیکن ۱۸۰۰ء میں نانا فرنویس کے مرتے ہی مرہٹوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

جسونت راؤ ہلکر یہ چاہتا تھا کہ نانا فرنویس کے بعد پونا کے پیشوا پر اس کا اقتدار قائم ہو جائے۔ مگر دولت راؤ سندھیا جو پیشوا کا پُرانا معاون تھا وہ کہتا تھا کہ پیشوا پر پہلا حق میرا ہے۔ غرضکہ پونا کی مرکزی مرہٹہ حکومت کے پیشوا پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے ہلکر اور سندھیا میں بُری طرح جنگ چھڑ گئی۔ اور اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہلکر جو ایک مَن چلا سپہ سالار تھا۔ اُس نے سندھیا اور پیشوا دونوں کو مغلوب کر لیا۔

پیشوا پونا سے فرار ہو کر انگریزوں کی پناہ میں چلا گیا۔ انگریز موقعہ کے منتظر ہی تھے۔ فوراً پیشوا پر "سب سیڈیری سسٹم" کا جال ڈال دیا گیا۔ باجی راؤ پیشوا اس جال میں پھنس گیا اور اُس نے دسمبر ۱۸۰۲ء میں انگریزوں سے معاہدہ کر لیا۔ جو عہد نامہ بیسین کے نام سے مشہور ہے۔ اس عہد نامہ کی رُو سے یہ طے پایا کہ پونا میں انگریزوں کی امدادی فوج رہا کرے گی۔ پیشوا اُس کے مصارف کے لئے ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ کی مالگذاری کا علاقہ کمپنی کو دے گا۔ پیشوا کسی بیرونی ریاست یا حکومت سے خارجی تعلقات انگریزوں کی مرضی کے بغیر قائم نہیں کرے گا۔ اور انگریزوں کے سوا کسی یورپین کو اپنے علاقہ میں نہیں رہنے دے گا۔ نظام یا کسی دوسرے حکمراں سے اگر مرہٹوں کا جھگڑا ہو گا تو انگریزوں کو اختیار ہو گا کہ وہ اُس جھگڑے کو جس طرح چاہے طے کرا دیں۔ انگریز بیرونی حملے سے پیشوا کی حفاظت کریں گے۔ غرضکہ پیشوا کی حفاظت کے نام پر گورا فوج پونا پہنچ گئی۔ پیشوا انگریزوں کا طوق غلامی گردن میں ڈال کر پھر پونا کی گدی پر جا بیٹھا۔ اور فرانسیسوں کو فوج سے نکال دیا گیا۔

مرہٹوں اور انگریزوں میں دوسری جنگ

پیشوا کے انگریزوں کی گود میں جا بیٹھنے کے بعد جسونت راؤ ہلکر تو اندور میں خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ لیکن سندھیا اور بھونسلا یہ برداشت نہ کر سکے کہ مرہٹوں کی مرکزی حکومت انگریزوں کے قبضہ میں چلی جائے ان دونوں نے مل کر پونا کی طرف بڑھنا چاہا تو ویلزلی نے خطوط کے ذریعہ ان دونوں کو متنبہ کر دیا کہ "خبردار پونا کی طرف نہ دیکھنا ورنہ تمہارے خلاف سخت فوجی کارروائی کی جائے گی" یہ دھمکی تو نام کے لئے تھی۔ ویلزلی خود چاہتا تھا کہ موقع ملتے ہی اُس سندھیا کو ختم کر دے جس نے کہ شمالی ہند میں مغل بادشاہ کے دربار تک غیرمعمولی اقتدار حاصل کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ سندھیا کا سب سے بڑا ناقابل معافی گناہ یہ تھا کہ اُس کے ہاں بہت سے فرانسیسی فوجی افسر موجود تھے۔

لارڈ ویلزلی نے فوراً اپنے بھائی آرتھر ویلزلی کو حکم دیدیا کہ وہ مرہٹوں کے خلاف یورش شروع کر دے۔ ساری تیاریاں تو پہلے ہی سے مکمل تھیں۔ صرف حکم کی دیر تھی۔ چنانچہ ۱۸۰۳ء میں چھ مختلف مورچوں سے انگریزوں کی فوجیں مرہٹوں کو کچلنے کیلئے آگے بڑھنے لگیں۔ اور انگریزوں نے احمد نگر فتح کر لیا۔ اسائی کے میدان میں مرہٹوں اور انگریزوں کا شدید مقابلہ ہوا۔ مرہٹوں نے اپنی روایتی بہادری کا ثبوت دیا۔ لیکن مرہٹوں کی سنگینیں انگریزوں کی تباہ کن توپوں کا کہاں تک مقابلہ کر سکتی تھیں۔ اگرچہ پھر بھی کئی موقعوں پر مرہٹے انگریزوں پر غالب رہے۔ مگر اس ہنگامہ آرائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر میں مرہٹوں کو شکست ہو گئی۔

ادھر شمالی ہند میں جنرل لیک مرہٹہ اقتدار کو ختم کرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کانپور سے علی گڈھ پہنچا اور وہاں سندھیا کے فرانسیسی جرنیل کو شکست دی۔ اور اسکے بعد لسواڑی میں شدید جنگ ہوئی۔ لسواڑی میں فرانسیسی سرداروں اور مرہٹہ فوج

کی شکست کے بعد آگرہ اور دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ جنرل لیک نے دہلی فتح کرنے کے بعد مرہٹوں کو مار مار کر نکال دیا۔ اور نام نہاد مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کو اپنی نگرانی میں لینے کے بعد ایک لاکھ روپیہ سالانہ اُس کی پنشن مقرر کر دی۔

سندھیا اور بھونسلا بھی انگریزوں کے نیاز مند

جنوبی ہند اور شمالی ہند میں انگریزوں کے مقابلہ میں مرہٹوں کی پے در پے شکستوں نے بھونسلا اور سندھیا دونوں کا دھڑ توڑ دیا اور یہ دونوں اس بات کے لئے مجبور ہو گئے کہ پیشوا کی تقلید کرتے ہوئے انگریز کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیں۔ چنانچہ ناگپور کے راجہ بھونسلا نے دسمبر ۱۸۰۳ء میں عہد نامہ دیوگاؤں کے نام سے معاہدہ کر کے اپنے آپ کو انگریزوں کی اطاعت کا پابند کر لیا۔ اور اڑیسہ کا ملک انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

اسی مہینے سندھیا نے بھی عہد نامہ ارجن گاؤں پر دستخط کرنے کے بعد "انگریزوں" کی غلامی قبول کر لی۔ اور اس عہد نامہ کی رُو سے دوآب کا تمام علاقہ احمد نگر اور بروچ انگریزوں کو دیدیئے۔ غرضکہ مرہٹوں کا یہ سب سے طاقتور فرمانروا بھی انگریزوں کے نیاز مندوں میں شامل ہو گیا۔

ہلکر سے انگریزوں کی لڑائی

پیشوا۔ سندھیا اور بھونسلا تو اپنی آزادی انگریزوں کے ہاتھوں فروخت ہی کر چکے تھے۔ صرف جسونت راؤ ہلکر باقی رہ گیا تھا۔ جو اندور میں بیٹھا ہوا سندھیا اور بھونسلا کی تباہی پر خوش ہوتا رہا۔ حالانکہ اُس کی قومی غیرت کا تقاضہ یہ تھا کہ اس نازک وقت میں انگریزوں کے مقابلہ میں سندھیا اور بھونسلا کا ساتھ دیتا۔ کیونکہ ان دونوں کی تباہی مرہٹہ قوم کی تباہی کے ہم معنی تھی۔ لیکن اس نے محض سندھیا اور

بھونسلا سے ذاتی رقابت کی بنا پر قومی فرض سے منھ موڑ لیا جس کی سزا اُسے یہ ملی کہ ویلزلی نے سندھیا اور بھونسلا سے فرصت پاتے کے ساتھ ہی اندور کی جانب اپنی فوجوں کا رُخ موڑ دیا۔ ہلکر نے ہر چند چاہا کہ انگریز صلح کر لیں لیکن جو انگریز مرہٹوں کی تین بڑی طاقتوں کو ختم کر چکے تھے وہ اس چوتھے راجہ کو کہاں چھوڑنے والے تھے چنانچہ ۱۸۰۴ء میں ہلکر کے ساتھ انگریزوں کی جنگ چھڑ گئی۔

ہلکر ایک نہایت ہی ہوشیار سپہ سالار تھا۔ اُس نے باقاعدہ میدان میں جم کر لڑنے کی بجائے پنڈاریوں کو اپنے ساتھ ملا کر ہر چہار طرف سے انگریزوں پر چھاپے مارنے شروع کر دئے جس کی وجہ سے انگریز فوجوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ کئی مورچوں پر انگریزوں کو نہ صرف شکست ہوئی بلکہ انھیں سامانِ جنگ بھی چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

ہلکر نے متھرا پر قبضہ کر لیا۔ اور اُس کی فوجیں دہلی کی جانب بڑھنے لگیں ہلکر کی غیر موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر انگریزوں نے اُس کے مالوہ کے مقبوضات پر قبضہ جما لیا۔ قبل اس کے کہ ہلکر دہلی پہنچے جنرل لیک دہلی پہنچ چکا تھا۔ مغل بادشاہ جنرل لیک کا ممد و معاون بنا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں ہلکر کے لئے دہلی فتح کرنا کیونکر ممکن تھا۔ وہ دہلی فتح نہ کر سکا۔ اور سہارنپور کی جانب چل دیا۔

جنرل لیک شکاری کتے کی طرح اُس کا پیچھا کر رہا تھا۔ ہلکر بھرت پور چلا گیا۔ اور ڈیگ کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ اس قلعہ پر انگریزی توپوں نے بم باری شروع کر دی۔ اس بم باری کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں نے قلعہ فتح کر لیا۔ اب ہلکر بھرت پور کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا۔ انگریزوں نے بھرت پور کے قلعہ پر

بھی بم باری شروع کر دی۔ بھرت پور کے تمام علاقہ کو انگریزوں نے اس امید میں برباد کر ڈالا کہ بھرت پور کا راجہ رنجیت شاید تنگ آ کر اس مرہٹہ پناہ گزین کو انگریزوں کے حوالے کر دے۔ لیکن وطن دوست راجہ بھرت پور نے سلطنت کسی قیمت پر بھی ہلکر جیسے بہادر مہمان کو انگریزوں کے حوالے نہ کیا۔

جنرل لیک نے بھرتپور کے قلعہ کو فتح کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ مگر راجپوتوں اور جاٹوں نے ہر مرتبہ اُسے شکست دی۔ غرضکہ بھرت پور کا قلعہ انگریزوں کے لئے ناقابلِ تسخیر بن گیا۔ اس لئے نہیں کہ یہ کوئی بہت مضبوط یا سنگین قلعہ تھا۔ یہ تو معمولی مٹی کا بنا ہوا قلعہ تھا۔ مگر اس کے ناقابلِ تسخیر ہونے کی وجہ یہ تھی کہ یہاں انگریزوں کے لئے ایسے غدار ناپید تھے۔ جو آن کی آن میں سازش کر کے بڑے سے بڑے قلعے فتح کرا دیتے تھے۔

جنرل لیک نے مجبور ہو کر راجہ بھرت پور سے صلح کی درخواست کی جسے راجہ نے قبول کر لیا۔ ہلکر بھرت پور سے پنجاب چلا گیا۔ تاکہ رنجیت سنگھ سے امداد لے سکے۔ لیکن اُس نے پنجاب کے رنجیت سنگھ کو بھرت پور کے رنجیت سے بالکل مختلف پایا بھرت پور کے رنجیت نے تو ہلکر کے لئے بڑی سے بڑی مصیبت مول لی تھی مگر پنجاب کے رنجیت سنگھ نے ہلکر جیسے پریشان حال محبِ وطن کے لئے انگریزوں کی دشمنی خریدنا۔ ایک حماقت تصور کیا۔ چنانچہ ہلکر کو اس "شیر پنجاب" کی جانب سے مایوس ہونا پڑا۔ اور وہ کسی دوسری طرف نکل گیا۔

ویلزلی کے خلاف ناراضگی

ویلزلی نے خواہ مکاری سے کام لیا یا ابن الوقتی سے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُس نے ہندوستان کے بیشتر علاقوں کو انگریزی مقبوضات میں شامل کر کے اپنی قوم کے ساتھ احسانِ عظیم کیا تھا۔ لیکن انگلستان کے

تاجروں کی قوم جو روپیہ کی بھوکی تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ ویلزلی کی لڑائیوں کی وجہ سے کمپنی کے خزانے میں چوہے لوٹ رہے ہیں تو ویلزلی کے خلاف سخت ناراضگی کا اظہار کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ویلزلی ہلکر کی لڑائی کو ادھورا چھوڑ کر ۱۸۰۵ء میں لندن کے لیئے روانہ ہو گیا۔ اور اپنے عہدہ کا چارج پرانے گورنر جنرل لارڈ کارنوالس کو دے گیا۔ جو اُس کی روانگی سے قبل ہی کلکتہ پہنچ چکا تھا۔

لارڈ کارنوالس کو کمپنی کے ڈائرکٹروں نے خاص طور پر اس مقصد کے لئے بھیجا تھا کہ وہ ویلزلی جیسے جنگجو سے چارج لینے کے بعد دیسی والیانِ ملک سے اُن لڑائیوں کو ختم کرے جنہوں نے کمپنی کو دیوالیہ بنا دیا ہے۔ لیکن لارڈ کارنوالس جس کی صحت پہلے ہی بگڑ چکی تھی ہندوستان آنے کے بعد صرف دو ڈھائی مہینے زندہ رہنے کے بعد مر گیا۔

جارج بارلو کا مختصر عہدِ حکومت

لارڈ کارنوالس کی موت کے بعد ۱۸۰۵ء میں سر جارج بارلو جو کمپنی کا پُرانا ملازم تھا۔ گورنر جنرل مقرر ہوا۔ بارلو اگرچہ لارڈ ویلزلی کی ماتحتی میں ویلزلی کی جنگی پالیسی کا سب سے بڑا معاون اور مددگار تھا۔ لیکن جُون ہی اسے بورڈ آف ڈائرکٹرس کی یہ ہدایت ملی کہ وہ "عدم مداخلت" کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے جنگی اقدامات اور ہنگاموں کو ختم کر دے تو وہ اس ہدایت کے ملنے کے بعد اوّل درجہ کا امن پسند بن گیا۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی جسونت راؤ ہلکر سے اور امیر خاں پنڈاری سے نہایت نرم شرطوں پر صلح کر لی۔

بارلو کی عدم مداخلت کی پالیسی اس حد تک بڑھی کہ سب سبسڈیری سسٹم کا سارا انتظام درہم برہم ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سندھیا اور ہلکر نے انگریزوں کی نرم

پالیسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شمالی ہند کے اکثر مقامات کو خوب لوٹا۔

ویلور کی ہندوستانی فوج کی بغاوت

بارلو کے عہدِ حکومت میں ویلور کی ہندی سپاہ نے ۱۸۰۶ء میں اس بنا پر بغاوت کر دی۔ کیونکہ ان کو ایک خاص قسم کی وردی پہننے کے لئے دی گئی تھی اور خاص قسم کی مونچھیں اور ڈاڑھی رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ان سپاہیوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ انگریزی سرکار ان کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے بغاوت کر کے یورپینوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ ویلور کے قلعہ سے سلطان ٹیپو کے بیٹوں کو نکال لیا۔ اور انھیں اپنا سردار بنا لیا۔ لیکن انگریز فوج نے فوراً موقعہ پر پہنچ کر ویلور کا قلعہ فتح کر لیا۔ باغیوں کو قتل کیا اور سلطان ٹیپو کے بیٹوں کو گرفتار کر کے کلکتہ بھیج دیا۔ جہاں وہ قید کر دئے گئے۔ ویلور کی اس بغاوت کے بعد سر جارج بارلو کو ۱۸۰۷ء میں گورنر جنرل کے عہدہ سے معزول کر کے مدراس کا گورنر بنا دیا گیا۔

لارڈ منٹو کا دورِ حکومت

لارڈ منٹو کمپنی کے بورڈ آف کنٹرول کا صدر رہ چکا تھا۔ اُسے کمپنی نے خاص طور پر اس مقصد کے لئے ۱۸۰۷ء میں برطانوی مقبوضات کا گورنر جنرل بنا کر بھیجا تھا تاکہ منٹو اُن کمزوریوں کو رفع کرے۔ جو اُس کے پیشرو کے زمانہ میں پیدا ہوگئی تھیں۔ اگرچہ منٹو کو بھی یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ "عدم مداخلت" کی پالیسی پر کاربند رہے۔ لیکن منٹو اس پر کاربند نہ رہ سکا۔ اور اُس کو پنجاب اور دوسرے علاقوں کے معاملات میں دخل دینا پڑا۔

ریاست ٹراونکور میں بغاوت

ریاست ٹراونکور زمانۂ دراز سے انگریزوں کی دوست بنی ہوئی تھی۔

چنانچہ اسی ریاست ٹراونکور کو بہانہ بنا کر لارڈ کارنوالس نے ٹیپو کے خلاف جنگ کر کے اُسے نصف ریاست سے محروم کر دیا تھا۔ لارڈ ویلزلی جب گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آیا تھا۔ اور اُس نے ہندوستان میں سب سیڈیری سسٹم کا عیارانہ جال بچھایا تھا۔ تو اس ریاست نے بھی اس سسٹم کو قبول کرتے ہوئے برطانیہ کی کامل غلامی اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ ویلزلی ہی کے زمانہ سے ریاست میں انگریز ریزیڈنٹ رہنے لگا تھا۔ ۱۸۰۸ء میں ریاست کے وزیر اور ریزیڈنٹ میں ایسا شدید اختلاف پیدا ہوا کہ ریاست میں باقاعدہ انگریزوں کے خلاف بغاوت شروع ہو گئی۔ اس بغاوت میں بہت سے انگریز سپاہی اور شہری مارے گئے۔ لیکن انگریزوں نے فوراً ہی اس بغاوت کو طاقت کے ذریعہ دبا دیا۔ باغیوں سے سخت انتقام لیا گیا۔ ریاست کے وزیر نے خودکشی کر لی، اور انگریزوں کو اس ریاست پر قبضہ کا موقعہ مل گیا۔

بندیلکھنڈ پر فوج کشی

لارڈ منٹو کے ہندوستان پہنچنے کے بعد چند ہی روز بعد انگریزوں کو بندیلکھنڈ کی جانب سے شدید خطرہ محسوس ہونے لگا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بندیلکھنڈ میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے کمپنی کے مقبوضات خطرہ میں پڑ جاتے۔ لیکن منٹو کو تو ویلزلی کی ملک گیری کی پالیسی کو زندہ کرنا تھا۔ چنانچہ ۱۸۰۷ء میں انگریز فوجیں بندیلکھنڈ کے علاقہ پر چڑھا دی گئیں۔

یہ فوجیں برابر دو سال تک تمام علاقہ میں طوفان برپا کرتی رہیں آخر ۱۸۰۹ء میں بندیلکھنڈ کے امیروں اور رئیسوں کے سینہ پر خنجر رکھ کر مغلوب کر لیا گیا۔

راجہ رنجیت سنگھ انگریزوں کا نیازمند

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ پنجاب میں راجہ رنجیت سنگھ

نے نمایاں حیثیت حاصل کرلی تھی۔ بندہ بیراگی کے قتل کے بعد سکھوں میں انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ سکھ بارہ گروہوں میں جن کو کہ بارہ مثلیں کہتے ہیں بٹ گئے تھے۔ انھوں نے پنجاب کے مختلف علاقوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ ان بارہ مثلوں کے نام یہ ہیں :۔

(۱) ایلو والیہ (۲) بھنگی (۳) کنھیا (۴) سکھر چکیہ (۵) رام گڑھیا
(۶) نکئی (۷) پھلکیاں (۸) سنگھپوریا (۹) کروڑسنگھیا (۱۰) نشانیہ۔
(۱۱) ڈالی والیہ (۱۲) شہیدی۔

یہ بارہ مثلیں اکثر آپس میں بھی خانہ جنگی میں مبتلا رہتی تھیں لیکن جب مسلمانوں کے مقابلہ کا موقعہ آتا تھا تو سب متحد ہو جاتی تھیں۔ ان مثلوں میں سے سکھر چکیہ مثل کا سردار چڑت سنگھ تھا۔ رنجیت سنگھ اسی چڑت سنگھ کا پوتا تھا جس نے کہ باقی گیارہ مثلوں کو مغلوب کرنے کے بعد پنجاب میں سکھ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

راجہ رنجیت سنگھ کا عروج ۱۷۹۹ء سے شروع ہوا جب کہ اُس نے لاہور پر قبضہ جمایا۔ اور اپنی مدِمقابل سکھ پارٹیوں یعنی سکھ مثلوں کو شکست دیکر پنجاب میں اپنی ایک باقاعدہ حکومت قائم کرلی لیکن اس باقاعدہ حکومت کے باوجود بھی سکھ برابر لوٹ مار اور غارتگری میں مصروف رہتے تھے۔ چنانچہ جب لارڈ منٹو ہندوستان آیا تو اُس نے دیکھا کہ پنجاب میں راجہ رنجیت کی سرکردگی میں سکھوں نے بڑی شورش برپا کر رکھی ہے۔ اور اُن کی شورش اس قدر بڑھ گئی ہے کہ غیر سکھوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ جمنا اور ستلج کے درمیان جو سکھ ریاستیں آباد تھیں۔ اُن پر بھی رنجیت سنگھ کے آدمیوں نے حملے کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر لارڈ منٹو کو راجہ رنجیت سنگھ کی جانب سے بڑی تشویش پیدا ہوئی۔

انگریز اس بات کے تو خواہشمند تھے کہ شمالی اور مغربی پنجاب میں سکھوں کا زور بڑھ جائے۔ تاکہ وہ ان کو ضرورت کے وقت افغان حملہ آوروں سے کے مقابلہ پر استعمال کر سکیں لیکن ان کے جمنا کی جانب بڑھنے سے کیونکہ خود انگریزوں پر براہ راست زد پڑتی تھی۔ اس لئے لارڈ منٹو نے ستلج کی آس پاس کی تمام ریاستوں کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اور چارلس مٹکاف کو ایلچی بنا کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس لاہور روانہ کیا۔ تاکہ وہ رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے تعلقات کے بارے میں معاملات طے کر لے۔

رنجیت سنگھ پنجاب سے ہلکر کو نکال کر اور انگریزی فوجوں کو ہلکر کے تعاقب میں امرتسر تک داخل ہونے کی اجازت دے کر پہلے ہی انگریزوں کے ساتھ نیازمندی کا ثبوت دے چکا تھا۔ بھلا وہ انگریزوں کی کسی پیش کش کو کیونکر ٹھکرا سکتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۰۹ء میں انگریزوں اور سکھوں کے مابین امرتسر میں ایک عہدنامہ ہو گیا جس کی رو سے انگریزوں اور سکھوں میں دوستی کا عہد ہو گیا۔ رنجیت سنگھ نے یہ وعدہ کر لیا کہ وہ ستلج کے قرب و جوار کی ریاستوں پر کسی قسم کی دست درازی نہیں کرے گا۔ انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا معاہدہ ہے جو امرتسر میں ہوا۔

ہندوستان کو غلام رکھنے کیلئے اسلامی ممالک سے جوڑ توڑ

انگلستان اور فرانس میں

پھر ایک بار جب لڑائی چھڑی تو لارڈ منٹو کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں فرانسیسی ہندوستان کی جانب رخ کر کے ہندوستان کی اُن طاقتوں کو دوبارہ زندہ نہ کر دیں۔ جن کو بڑی جانفشانی کے بعد کچلا گیا ہے۔ چنانچہ لارڈ منٹو نے لڑائی چھڑتے ہی فوراً ہندوستان کی ناکہ بندی شروع کر دی۔ اس لئے نہیں کہ ہندوستان کو کسی بیرونی حملے

سے بچانا مقصود تھا۔ بلکہ اس لئے کہ ہندوستان کے تنِ مُردہ میں جان پڑ جانے کے اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔

سب سے پہلے امیران سندھ کے پاس وفود بھیجے گئے، اُن کے ساتھ دوستی کے معاہدے ہو گئے اور یہ طے پا گیا کہ کمپنی ہمیشہ اُن کی دوست رہے گی۔ ان سے وعدہ لے لیا گیا کہ وہ کسی بیرونی طاقت کو نہ تو اپنے علاقہ میں گھسنے دیں گے اور نہ اُن کو اپنے علاقے سے گزرنے دیں گے۔ اس زمانہ کی ممتاز ترین سندھی ریاستیں یہ تھیں۔ ریاست خیرپور۔ ریاستِ حیدرآباد سندھ۔ ریاست میرپور۔ ان ریاستوں پر بلوچی سردار فائز تھے۔ جو امیرانِ سندھ کہلاتے تھے۔

مسٹر الفنسٹن کو ایلچی بنا کر شاہ افغانستان کے پاس کابل بھیجا گیا۔ افغانستان میں اس وقت سابق شاہ افغانستان زماں شاہ کا چھوٹا بھائی شاہ شجاع حکمراں تھا جو انگریزوں کی عیارانہ پالیسی کے طفیل میں تخت پر بیٹھا تھا۔ انگریزوں کے لئے اس پرانے نیاز مند کو ہموار کر لینا بھلا کیا دشوار تھا۔ چنانچہ الفنسٹن نے شاہ شجاع سے انگریزوں کی دوستی کے ایک معاہدہ پر دستخط لے لئے۔

جان میکولم کو بطور ایلچی ایران روانہ کیا گیا جس نے شاہِ ایران سے ایک معاہدہ کر لیا کہ شاہِ ایران کسی یورپین طاقت کو نہ تو ایران میں اُترنے دیگا۔ اور نہ ایران کے راستے ہندوستان کی جانب بڑھنے دے گا۔

۱۸۰۹ء میں لارڈ منٹو نے قرب وجوار کے جزیروں پر قبضہ جمانے کے لئے ایک سمندری بیڑا روانہ کیا جس نے کہ ماریشس بوربان اور چند اہم جزیروں پر قبضہ جما لیا۔ اس کے علاوہ یہ بیڑا جاوا پر بھی قابض ہو گیا۔ جو کہ بعد میں لندیزوں

کو واپس دیدیا گیا تھا۔ غرضکہ لارڈ منٹو نے ہندوستان کی کامل ناکہ بندی کر دی تھی تاکہ ہندوستان کو کسی طرف سے بھی بیرونی امداد نہ مل سکے۔

لارڈ منٹو کے دورِ حکومت میں اگرچہ کمپنی کو جدید فتوحات حاصل نہیں ہو سکیں لیکن لارڈ منٹو نے برطانوی مقبوضات کو مضبوط کرنے اور محفوظ کرنے میں بڑی کوشش سے کام لیا تھا۔ وہ ۱۸۱۳ء میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد لندن واپس چلا گیا۔ اُس کے دور کا ایک اہم ترین کارنامہ یہ بھی تھا کہ کمپنی کی واحد تجارتی اجارہ داری ختم کر دی گئی تھی۔ اور اب ہر انگریز کو ہندوستان سے تجارت کرنے کی آزادی مل گئی تھی۔

مارکوئس آف ہسٹنگز کا دورِ حکومت

مارکوئس آف ہسٹنگز اگرچہ بارلو اور منٹو کی طرح۔ یہی کہتا ہوا ۱۸۱۳ء میں ہندوستان آیا تھا کہ وہ جنگ وجدل سے کوئی سروکار نہیں رکھے گا۔ لیکن ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد ملک گیری کی ہوس اُسے جنگ وجدل سے باز نہ رکھ سکی۔ چنانچہ اُس کے عہد میں کئی بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں اور اُس کی جارحانہ پالیسی کسی طرح بھی ویلزلی کی پالیسی سے بہتر نہ تھی۔ چنانچہ مارکوئس ہسٹنگز نے ہندوستان کی اُن حریت پرست پہاڑی اقوام کو زیر کرنے میں اپنی ساری طاقت صرف کر دی جن کا کہ انگریزوں سے کسی قسم کا کوئی تنازعہ نہ تھا۔ غالباً اُن کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ یہ اقوام بہادر تھیں اور انگریز کی غلامی کو نفرت کی نظر سے دیکھتی تھیں۔

نیپال کے خلاف جنگ

نیپالی گورکھے جو تاتاری یا مغل نسل سے تھے۔ زمانۂ دراز سے نیپال کے علاقہ میں آزادانہ زندگی گذار رہے تھے۔ چونکہ پہاڑی علاقہ پیداوار کے لحاظ

سے ان کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے وہ میدانی علاقوں کو اپنا وطن سمجھتے ہوئے ستلج تک بڑھ آئے تھے اور اُنکی کوشش یہ تھی کہ وہ دریائے گنگا کے زرخیز علاقوں کو اپنے ملک کی سرحد قرار دینے کے بعد یہاں کھیتی باڑی شروع کر دیں لیکن انگریز یہ کیونکر گوارا کر سکتے تھے کہ ایک بہادر پہاڑی قوم پہاڑوں سے نکل کر میدانی علاقہ تک پھیل جائے۔ چنانچہ مارکوئس ہیسٹنگز نے پہلے تو خط و کتابت کے ذریعہ ان کو دھمکایا۔ جب وہ قابو میں نہ آئے تو ۱۸۱۴ء میں ان کے خلاف اس جرم میں اعلانِ جنگ کر دیا۔ کیونکہ وہ اپنے وطن کے ایک زرخیز علاقہ میں سکونت اختیار کرنا چاہتے تھے۔

جنگ نیپال میں گورکھوں نے جس غیر معمولی جرأت کا ثبوت دیا۔ وہ اُن کی بہادری کا ایک غیر فانی کارنامہ ہے۔ گورکھا فوج کی تعداد بارہ ہزار سے بھی کم تھی۔ اس کے برخلاف انگریزوں کا لشکر کئی گنا زیادہ تھا۔ جو جدید ترین آلاتِ حرب سے آراستہ تھا اور کئی مورچوں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی گورکھوں کی قلیل تعداد فوج نے انگریز جنرل گلیسپی کو پے در پے تین مقامات پر شکستیں دیں۔ یہاں تک کہ اسی جنگ میں گلیسپی مارا گیا۔ اس ذلت آمیز شکست پر انگریز جھنجلا پڑے۔ انگریزی توپ خانہ نے گورکھوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور اُن پر پانی بند کر دیا۔ تب بھی انھوں نے ہتھیار نہ ڈالے بلکہ جو تھوڑے بہت محاصرہ سے نکل سکے وہ نکل گئے۔

اب انگریز فوج نے جنرل مارلے کی سرکردگی میں نیپالی پائے تخت کھٹمنڈو تک بڑھنے کی کوشش کی لیکن گورکھوں نے انگریز فوج کو راستہ ہی میں کاٹ کر رکھ دیا۔ حالانکہ خود انگریزوں کے بیان کے مطابق انگریز فوج گورکھوں کے مقابلہ میں دس گنی تھی۔ غرضکہ انگریز فوج میں ایسی ابتری پھیلی کہ جنرل مارلے

نے میدانِ جنگ سے فرار ہونے کے بعد واناپور میں آ کر دم لیا۔ اس جنگ میں تقریباً ہر مورچہ پر انگریزوں کو گورکھوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔

انگریزوں کا یہ پرانا داؤں ہے کہ جہاں اُن کی تلوار کارگر نہیں ہوتی وہاں عیاری کے خوفناک ہتھیار کو کام میں لایا جاتا ہے۔ چنانچہ کمایوں کے پہاڑیوں میں اچانک گورکھوں میں خانہ جنگی اور بغاوت پیدا ہو گئی۔ ان کے سردار بام سا نے جو دربار نیپال ہی کا امیر تھا۔ اور جسے کمایوں کی حفاظت کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ انگریزوں سے سازباز کر کے تمام مستحکم مقامات انگریزوں کے حوالے کر دئے۔ بام سا کی اس غداری کے بعد آزاد نیپال کے سردار امر سنگھ کا بازو ٹوٹ گیا۔ اُس کو بھی مجبوراً انگریزوں سے صلح کرنی پڑی۔ غرضکہ ۱۸۱۶ء میں سنگولی کا عہدنامہ ہو گیا جس کی رُو سے گورکھے۔ گڑھوال۔ ترائی۔ کمایوں اور تمام میدانی علاقوں کی سرزمین سے دستبردار ہو گئے۔ یعنی گورکھوں کی بہادر قوم نے بھی عالم مجبوری میں محض اپنے ہم وطنوں کی غداری کے طفیل میں انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دئے۔ یا یُوں کہیئے کہ انگریزوں کی عیاری اور ابن الوقتی نے اُنھیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

پنڈاریوں کو ختم کر دیا گیا

مارکوئس آف ہسٹنگز گورکھوں کو دبانے کے بعد ایک دوسری جنگجو جماعت یعنی پنڈاریوں کی جانب متوجہ ہوا۔ پنڈاری جن کو انگریز مورخوں نے لٹیرا اور ڈاکو ظاہر کیا ہے ہندوستان کی ایک ایسی بین الملّی فوجی جماعت تھی۔ جس میں جملہ مذاہب اور اقوام کے افراد شامل تھے یعنی ہندو مسلمان۔ مرہٹے راجپوت۔ جاٹ۔ سب ہی اس جماعت میں شامل تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ ان کے سردار زیادہ تر مسلمان تھے۔ چنانچہ ان کے ممتاز سرداروں کے

نام یہ تھے۔ امیر خاں۔ کریم خاں۔ دوست محمد خاں اور چیتو جاٹ۔

انگریز پنڈاریوں سے اس لئے بھی خفا تھے۔ کیونکہ پنڈاریوں کی جماعت نے انگریزوں کے خلاف سندھیا اور ہلکر کی امداد کی تھی۔ انگریزوں کا خیال تھا۔ کہ اگر پنڈاریوں نے ہلکر کی مدد نہ کی ہوتی تو ہلکر بھی دوسرے مرہٹہ سرداروں کی طرح انگریزوں کے سامنے جھکنے کے لئے مجبور ہو جاتا۔

پنڈاریوں کو زیر کرنے کے لئے انگریزوں کو کس قدر اہتمام کرنا پڑا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کے مقابلے کے لئے انگریزوں نے ایک لاکھ بیس ہزار فوج فراہم کی تھی۔ اتنی بڑی فوج ہندوستان میں انگریزوں نے اس سے قبل کبھی نہیں جمع کی تھی۔ اور اتنی بڑی فوج کے جمع کرنے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ پنڈاریوں کے ساتھ ساتھ سندھیا ہلکر اور دوسرے مرہٹہ سرداروں کے خلاف بھی مہم شروع کر دی جائے۔ کیونکہ انگریزوں کا خیال تھا کہ مرہٹہ سردار پنڈاریوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

سب سے پہلے پنڈاریوں کو کچلنے کے لئے وسطی ہند میں فوج اُتاری گئی۔ چاروں طرف سے پنڈاریوں کو گھیر گھیر کر اُن کا شکار کیا گیا۔ پنڈاریوں کا چونکہ کوئی خاص مسکن یا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اور یہ ایک بے ترتیب جماعت تھی۔ اس لئے اُس کو ختم کرنے میں انگریزوں کو کوئی دُشواری نہ ہوئی۔ غرضکہ ان کے گروہ کے گروہ قتل ہو گئے اور ۱۸۱۷ء میں ان کا سارا زور ٹوٹ گیا۔ امیر خاں پنڈاری جس نے انگریزوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ اُس کو انگریزوں نے ریاست ٹونک کا نواب بنا دیا۔ چیتو۔ چیتے کے حملہ سے مارا گیا۔ اور دوسرے پنڈاری سردار تباہ و برباد ہو گئے۔

مرہٹوں کا خاتمہ بالخیر

پنڈاریوں کے بعد مارکوئس آف ہسٹنگز مرہٹوں کی جانب متوجہ ہوا۔ اُسے یہ بات نہایت شاق گذرتی تھی کہ اب بھی مرہٹوں میں پیشوا کی سیادت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ پیشوا کو بالکل مفلوج کرنے کے لئے ہسٹنگز نے اُسے ایک نیا عہد نامہ کرنے پر مجبور کیا۔ باجی راؤ پیشوا نے اس ذلّت آمیز عہد نامہ کو مسترد کر دیا۔ اور اس کے بعد ۱۸۱۸ء میں پیشوا اور انگریزوں میں جنگ چھڑ گئی۔ پیشوا کو اُمید تھی کہ اس جنگ میں سندھیا۔ بھونسلا۔ اور دوسرے مرہٹہ سردار اُس کی ضرور مدد کریں گے۔ لیکن اُس کی توقعات غلط ثابت ہوئیں۔ اُس نے تن تنہا انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن اُسے انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ہسٹنگز نے اُسے معزول کر کے جلا وطن کر دیا اور اُسے کانپور کے قریب بٹھور میں بقیہ زندگی گذارنی پڑی۔ انگریزوں نے اس کا آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔

پیشوا سے جنگ کے دوران ہی میں انگریزوں نے سندھیا اور بھونسلا کو بے دست و پا کر دیا تھا۔ سندھیا سے ایک نیا معاہدہ کر کے انگریزوں کی امداد کے لئے اُسے مجبور کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ بھونسلا کو ناگپور کی گدّی سے اُتار کر اُس کے پوتے کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اور اس کی تقریباً ساری ریاست کو کمپنی کے مقبوضات میں شامل کر لیا گیا۔

جس زمانہ میں انگریز فوجیں پیشوا سے لڑ رہی تھیں۔ اُسی زمانہ میں انگریزوں نے اندور پر بھی یورش کر رکھی تھی۔ جسونت راؤ ہلکر مر چکا تھا۔ اُس کے کم سن بیٹے کی جانب سے ہلکر کی بیوہ تلسی بائی حکومت کر رہی تھی۔ تلسی بائی چونکہ انگریزوں سے صلح کے حق میں تھی۔ اس لئے مرہٹوں نے اُسے قتل کر دیا۔ لیکن رانی کے

قتل کے بعد اندور کے مرہٹے انگریزوں کے مقابلہ پر زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے مہدپور کے میدان میں مرہٹوں کو شکستِ فاش ہوگئی۔ ہسٹنگز نے ریاست کا بیشتر علاقہ کمپنی کے مقبوضات میں شامل کرلیا۔ جو باقی رہ گیا اُس میں انتظام کے لئے انگریز ریذیڈنٹ کے ماتحت ایک انتظامی کونسل بنادی یعنی اندور بھی انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ غرضکہ مارکوئس آف ہسٹنگز نے ایک ہی وقت میں پیشوا۔ سندھیا۔ بھونسلا اور ہلکر یعنی تمام مرہٹہ فرمانرواؤں کو ختم کر دیا اور اس طرح مرہٹہ حکومت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔

مارکوئس آف ہسٹنگز کے زمانہ کے چند خاص واقعات

مارکوئس آف ہسٹنگز نے لڑائیوں سے فارغ ہونے کے بعد اندرونی اصلاحات کی جانب بھی کچھ توجہ کی تھی۔ لیکن ان اصلاحات کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔

ہسٹنگز کے دورِ حکومت کا سب سے مشہور کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے ہندوستانی اخبار نویسوں کا گلا گھوٹنے کے لئے ایک ایسا سیاہ قانون بنایا تھا۔ جس کی مثال شاید ہی دُنیا کے کسی حصّہ میں مل سکے۔ اس قانون کی رُو سے ۱۸۱۸ء میں حکومت کو یہ حق دے دیا گیا تھا کہ وہ جس اخبار والے سے خفا ہو اُسے بغیر مقدمہ چلائے جلاوطن کر دے۔

ہسٹنگز کا ایک دوسرا کارنامہ اُس کا قائم کردہ حیدرآباد کا وہ بنک تھا جسے حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس بنک کی لوٹ کا یہ عالم تھا کہ یہ ریاست کو جو روپیہ بھی قرض دیتا تھا اُس پر ۲۵ فی صدی سود وصول کرتا تھا۔ چنانچہ بنک والوں نے کفالت میں ریاست حیدرآباد کے بعض علاقے بھی رہن رکھ لئے تھے۔ جب اس بنک کی ظالمانہ شرح سود پر لندن کے

اخبارات میں لے دے ہوئی تو یہ بنک چند روز کے بعد ہی ٹوٹ گیا۔ انگلستان میں اس واقعہ سے ہسٹنگز کی اس قدر بدنامی ہوئی کہ اُسے استعفٰے دینا پڑا ہیسٹنگز پر الزام یہ تھا کہ اُس نے حصولِ زر کی خاطر اپنے بعض دوستوں کے پردہ میں خود یہ بنک جاری کرایا تھا۔ اور حقیقت بھی یہی تھی۔

لارڈ ایمہرسٹ کا دورِ حکومت

۱۸۲۳ء میں مارکوئس آف ہسٹنگز کے مستعفی ہونے کے بعد لارڈ ایمہرسٹ انگریزی مقبوضات کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ لارڈ ایمہرسٹ کے دورِ حکومت کا اہم ترین واقعہ برما کی آزادی پر انگریزوں کی وہ کاری ضرب ہے جس نے کہ ہندوستان کی طرح برما کو بھی انگریزوں کا غلام بنا دیا۔

انگریز فوجی افسروں کی جانب سے لارڈ منٹو ہی کے زمانہ سے برما پر فوج کشی کے لئے زور دیا جارہا تھا۔ چنانچہ کپتان لننگ جو برما میں انگریزوں کا سفیر تھا۔ اُس نے لارڈ منٹو پر بے حد زور دیا تھا کہ وہ برما پر فوراً حملہ کردے۔ لیکن ایک تو اُس زمانہ میں انگلستان اور فرانس کے درمیان جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اس لئے لارڈ منٹو پیش قدمی نہ کرسکا۔ دوسرے اتنی بڑی اور دُور دراز کی لڑائی کے لئے کمپنی کے خزانہ میں روپیہ بھی نہ تھا۔ لہٰذا لارڈ منٹو کو خاموش ہو جانا پڑا۔ اگر حالات سازگار ہوتے تو شاید لارڈ منٹو ہی کے زمانہ میں برما پر انگریزوں کا حملہ ہو جاتا۔

برما کے راجہ کو زیر کر لیا گیا

برما کو زیر کرنا چونکہ انگریزوں کے فوجی پروگرام میں بہت پہلے سے شامل ہو چکا تھا۔ اس لئے لارڈ ایمہرسٹ نے یہ بہانہ بنا کر کہ "برمی انگریزی مقبوضات کے علاقوں پر حملے کرتے ہیں"۔ ۱۸۲۴ء میں برما کے راجہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اور

اس اعلانِ جنگ کے ساتھ ہی ایسی سُرعت اور تیزی کے ساتھ انگریزوں نے پیش قدمی کی کہ حملے کے فوراً ہی بعد کمپنی کے سپاہیوں کا رنگون پر قبضہ ہو گیا۔

برمیوں نے رنگون سے پسپا ہوتے ہوئے رنگون کی ہر مفید اور کار آمد چیز کو نذرِ آتش کر دیا۔ تاکہ دشمن اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ اس کے بعد برمیوں نے کئی مقامات پر بڑی دلیری کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ اور ان کو شکستیں بھی دیں۔ یہ جنگ تقریباً دو سال جاری رہی۔ لیکن آخر میں برمیوں کو دب کر انگریزوں کے ساتھ صلح کرنی پڑی۔

انگریزوں اور برمیوں کی یہ صلح "معاہدہ یندبو" کے نام سے مشہور ہے۔ جو ۲ جنوری ۱۸۲۶ء کو ہوا جس کے بعد ہندوستانیوں کی طرح برمیوں نے بھی انگریزوں کے قدموں کی برکت سے اپنی آزادی کھو دی۔ غرضکہ جنوبی برما اور آسام پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

ناقابلِ تسخیر بھرتپور کی فتح

۱۸۰۴ء میں ولزلی نے محض اس جرم میں قلعہ بھرتپور کو تباہ کر دینے کا حکم دے دیا تھا۔ کیونکہ راجہ بھرت پور نے اس قلعہ میں انگریزوں کے دشمن محبِّ وطن ہلکر کو پناہ دی تھی۔ لیکن انگریزوں کے ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود جب یہ قلعہ فتح نہ ہو سکا تو جنرل لیک کو مہاراجہ سے صلح کرنی پڑی لیکن صلح کے باوجود انگریز اپنی اس شکست کی ذلت کو نہ بھول سکے جو ان کو اس قلعہ کے سلسلہ میں اُٹھانی پڑی تھی۔

مہاراجہ بھرت پور کی موت کے بعد جب تخت کے دعویداروں میں جھگڑا چلا تو انگریز فوراً درمیان میں کود پڑے اور انھوں نے ٹھیک اُسی

زمانہ میں جب کہ برما کی جنگ ختم ہوئی تھی۔ ۱۸ جنوری ۱۸۲۶ء کو ۲۵ ہزار کے لشکرِ جرار کے ساتھ بھرتپور پر حملہ کر دیا۔ اس لئے نہیں کہ تخت کے دعویداروں کا جھگڑا چکانا مقصود تھا بلکہ اس لئے کہ ۱۸۰۴ء کی شکست کا انتقام لینا تھا۔ اس قدر جرار فوج کے باوجود بھی یہ قلعہ اُس وقت تک فتح نہ ہوا۔ جب تک کہ اس کی دیواروں کو بارود سے نہ اُڑا دیا گیا۔ دیواروں کے شکستہ ہو جانے کے بعد یہ تاریخی قلعہ بھی انگریزوں نے ۱۸۲۷ء میں فتح کر لیا۔

لارڈ ولیم بینٹنگ کا دورِ حکومت

انگریز مورخوں کی طرح ہندوستان کے مورخوں نے بھی لارڈ ولیم بینٹنگ کے دورِ حکومت کی بہت تعریف کی ہے۔ اور اُسے تعریف کا مستحق اس لئے قرار دیا ہے کیونکہ اُس کا زمانہ جنگ و جدل سے خالی رہا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ انگریز تقریباً تمام ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے۔ اُن کو ضرورت ہی کیا رہی تھی کہ وہ آئے دن لڑائیوں میں اُلجھے رہتے اس کے علاوہ جب کہ پچھلی لڑائیوں نے کمپنی کا خزانہ خالی کر دیا تھا۔ اور لندن ہائی کمانڈ بھی مزید فتوحات کے لئے روپیہ دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ تو لارڈ ولیم بینٹنگ کے لئے اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو فوجی جنرل کی بجائے ایک مصلح بنا کر پیش کرے۔ لیکن جہاں تک ہندوستان کو برطانوی پنجہ میں جکڑنے کا معاملہ تھا۔ لارڈ بینٹنگ کسی طرح بھی اپنے پیشرو گورنر جنرلوں سے کم سخت نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۸۳۵ء تک اپنے زمانہ حکومت میں ہندوستان کے نام نہاد حکمرانوں کو جس بُری طرح کچلا ہے کیا اس پر کوئی خوددار انسان فخر کر سکتا ہے۔

کورگ میسور اور اودھ پر نظرِ عنایت

ولیم بینٹنگ جس زمانہ

میں کہ مدراس کا گورنر تھا۔ اسے کورگ کی آزادی خار گذری تھی۔ چنانچہ گورنر جنرل بنتے ہی اُس نے کورگ کے راجہ کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۳۲ء میں کورگ کے مہاراجہ پر ظلم و تعدّی کا جھوٹا الزام لگا کر کورگ کی ریاست کو کمپنی کی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا۔ اسی طرح کچھار کو بھی کمپنی کی ملک قرار دیدیا گیا۔

ولیم بینٹنگ کو شائد یہ چیز ناگوار گذری تھی کہ سلطان ٹیپو کے بعد خواہ مخواہ ایک ہندو خاندان کو میسور کا راجہ بنا دیا گیا۔ چنانچہ ولیم بینٹنگ نے اپنی گورنر جنرلی کے زمانہ میں اس بات کی انتہائی کوشش کی کہ مہاراجہ کورگ کی طرح راجہ میسور کو بھی ختم کر دیا جائے۔ مگر عوام اور پڑوسی ریاستوں میں ہیجان پیدا ہو جانے کے خوف سے وہ صرف اس قدر کر سکا کہ راجہ میسور کو قطعی بے دست و پا کر کے ریاست کا انتظام انگریز افسروں کے سپرد کر دیا۔

ولیم بینٹنگ اودھ پر ہاتھ ڈال کر وہاں سے بھی نوابی کا خاتمہ کر دینا چاہتا تھا۔ مگر اُسے یکا یک نواب اودھ پہ ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ ہوئی۔ غرضکہ ولیم بینٹنگ کی عیارانہ پالیسی یہ تھی کہ ہندوستان میں جتنے بھی برائے نام نواب یا راجہ رہ گئے ہیں۔ اُن سب کو ختم کر دیا جائے اور انگریز بلاشرکت غیرے ہندوستان کے واحد مالک و مختار بن جائیں۔ اور ہندوستان میں کسی طاقت کے اُبھرنے کا شائبہ باقی نہ رہے۔ ولیم بینٹنگ کے ان عزائم سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہندوستانیوں کی املاک جائداد اور حقوق کے غصب کرنے کے معاملہ میں کسی سفاک سے سفاک گورنر جنرل سے پیچھے نہ تھا۔

ولیم بینٹنگ کے زمانہ کی اصلاحات

لارڈ ولیم بینٹنگ کی جن ملکی اور عدالتی اصلاحات

کا ڈھول پیٹا جاتا ہے۔ ان پر اگر گہری نظر سے غور کیا جائے تو وہ ہندوستانیوں کے لئے نہیں تھیں۔ بلکہ ہندوستان کے اُن سفید فام دشمنوں کے فائدہ کے لئے تھیں۔ جو ابد الآباد تک ہندوستان کو برطانیہ کا غلام بنائے رکھنا چاہتے تھے۔

یہ درست ہے کہ ولیم بنٹنگ کے دورِ حکومت میں ہندوستانیوں کو انگریزی پڑھانے کا سلسلہ شروع ہوا لیکن محض اس لئے کیونکہ انگریزوں کو انگریزی داں ہندوستانی کلرکوں کی سخت ضرورت تھی۔ ولیم بنٹنگ کا مقصد اگر فی الحقیقت ہندوستانیوں کے دماغوں کو علوم وفنون سے منور کرنا ہوتا تو وہ انگریزی کی بجائے اس ملک میں ہندوستانیوں کی مادری زبان کو فروغ دیتا اور مشرقی علوم وفنون کی ترقی میں نمایاں حصہ لیتا مگر وہاں تو مقصد ہی کچھ اور تھا۔

لارڈ ولیم بنٹنگ کے زمانہ کی اصلاحات کا نچوڑ یہ ہے کہ انگریزی زبان جاننے والے کلرکوں کی پیداوار کے لئے انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا۔ انگریزی طریقہ علاج رائج کرنے کے لئے کلکتہ میں میڈیکل کالج کھولا گیا۔ انگریز ملازمین چونکہ بہت گراں پڑتے تھے۔ اس لئے ہندوستانیوں کو بھی ملازمتیں ملنے لگیں۔ محکمہ عدالت میں اصلاحات کی گئیں۔ الہ آباد میں عدالتِ عالیہ قائم کی گئی۔ فارسی کی بجائے انگریزی اور ہندوستانی زبانیں عدالتی زبانیں قرار دی گئیں۔ فوج میں اصلاح کی گئی۔ کمپنی کا خزانہ چونکہ خالی ہو گیا تھا۔ اس لئے انگریزوں کی تنخواہیں کم کی گئیں۔ ستی کی رسم کے انسداد کے لئے قدم اُٹھایا گیا۔ اڑیسہ اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں کے ہندوؤں میں انسانی قربانی کا جو رواج تھا اُسے بند کر دیا گیا۔

لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہدِ حکومت کا اہم ترین واقعہ ۱۸۳۳ء کا وہ

فرمانِ شاہی ہے جو کمپنی کے سابقہ معاہدے کے ختم ہونے کے بعد جاری کیا گیا۔ اس فرمان کی رُو سے کمپنی کو حکم دیا گیا کہ انگریزی علاقہ کے کسی باشندہ کو محض رنگ نسل اور مذہب کی بنا پر کمپنی کی ملازمت یا عہدے سے محروم نہ کیا جائے اس فرمان سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ انگریزوں نے بخوشی جاری کیا تھا۔ بلکہ اس کے اجرا کا باعث کمپنی کے وہ مخالف انگریز تھے جنہوں نے کمپنی کے ملازمین کی دوست پروری کے خلاف پارلیمنٹ میں طوفان برپا کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کی چیخ و پکار سے مجبور ہو کر یہ فرمان جاری کیا گیا۔ مگر اس فرمان کے باوجود کالے ہندوستانیوں کو نہ صرف اعلیٰ عہدوں سے محروم رکھا گیا۔ بلکہ اُن کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا گیا۔

سر چارلس مٹکاف کا مختصر دورِ حکومت

سر چارلس مٹکاف کمپنی کا پرانا ملازم تھا۔ ولیم بینٹنگ کے جانے کے بعد ۱۸۳۵ء میں جب اسے عارضی طور پر ہندوستان میں برطانوی مقبوضات کا گورنر جنرل بنایا گیا تو یہ توقع تھی کہ اسے مستقل کر دیا جائے گا۔ لیکن اس سے ایک ایسا گناہ سرزد ہو گیا۔ جس کی بنا پر لندن ہائی کمانڈ اور بورڈ آف کنٹرول اس سے بیزار ہو گیا۔ اُس کا گناہ یہ تھا کہ اُس نے کمپنی کی حکومت میں ہندوستانیوں کو آزادی تحریر اور تقریر کا حق دیدیا تھا۔ کمپنی کے وہ لندنی زعما جنہوں نے کہ مارکوئس آف ہسٹنگز کے زمانہ میں بغیر مقدمہ چلائے اخبار نویسوں کو جلاوطن کرنے کا سیاہ قانون پاس کرایا تھا۔ وہ سر چارلس کی اس وسیع نظری کو بھلا کیسے گوارہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ لندن ہائی کمانڈ اس منصف مزاج انگریز سے اس قدر بیزار ہوا کہ اُس بیچارے کو ایک سال کے اندر ہی اندر کمپنی کی ملازمت سے مستعفی ہونا پڑا۔

لارڈ آک لینڈ اور ایلن برو

سر چارلس مٹکاف کے مستعفی ہونے کے بعد ۱۸۳۶ء میں لارڈ آک لینڈ کو گورنر جنرل کا عہدہ تفویض ہوا۔ لارڈ آک لینڈ نے ہندوستان کے بقیہ حصوں کا تو ذکر ہی کیا ہے افغانستان پر بھی جارحانہ پیش قدمی سے گریز نہیں کیا۔

افغانستان کے خلاف بلاوجہ یورش

وہ انگریز جو ہندوستان میں مقیم تھے جب اُن کو "فرانسیسی خطرہ" سے نجات ملی تو "روس کا خطرہ" ان کو ہر وقت پریشان رکھنے لگا۔ اور ان کو اندیشہ پیدا ہوا کہ روس جس کی سرحدیں دن بدن وسیع ہوتی چلی جارہی ہیں۔ اگر ایران یا افغانستان کے راستہ ہندوستان میں آن دھمکا تو انگریزوں کا کہیں ٹھکانا نہیں رہے گا۔ چنانچہ اِس خیالی خطرہ کے پیش نظر کپتان برنیر کو ایلچی بنا کر افغانستان بھیجا گیا۔ تاکہ وہ امیر افغانستان دوست محمد خاں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے بعد دوست محمد خاں سے انگریزوں کے حق میں اور روس کے خلاف معاہدہ کرلے۔

امیر افغانستان دوست محمد خاں نے کپتان برنیر کی بڑی خاطر و مدارات کی وہ انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے بھی تیار ہوگیا۔ لیکن جب امیر افغانستان نے روس سے ہندوستان کی حفاظت کے معاوضہ میں پشاور کا مطالبہ کیا تو انگریز راضی نہ ہوئے۔ بھلا انگریز اپنے جگری دوست راجہ رنجیت سنگھ سے پشاور لے کر اُسے کیونکر ناراض کرسکتے تھے۔ کپتان برنیر ناکام و نامُراد واپس چلا آیا اور افغانستان میں روس کے اثرات بڑھ گئے۔

جب اس طرح کام نہ چلا تو لارڈ آک لینڈ نے شاہ شجاع سابق شاہ افغانستان کے ذریعہ اپنا کام نکالنا چاہا۔ افغانستان کا یہ سابق بادشاہ اِن دنوں انگریزوں

کی پناہ میں ہندوستان میں تھا۔ انگریزوں نے اُسے دوبارہ افغانستان کے تخت پر بٹھانے کا نقشہ تیار کرلیا۔ چنانچہ انگریز فوجیں شاہ شجاع کو افغانستان کے تخت پر بٹھانے کے لئے ۱۸۳۸ء میں روانہ ہوگئیں تاکہ افغانستان کے تخت پر ایک ایسا حکمراں بیٹھ جائے جو میر جعفر کی طرح غدار ہو اور جو انگریزوں کے اشاروں پر ناچتا رہے۔ غور کیجئے کہ ہندوستان کی خاطر بیچارے انگریزوں کو کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھانی پڑی ہیں۔

انگریزی فوجیں جن کو اس جارحانہ سرگرمی میں راجہ رنجیت سنگھ کی پوری امداد و اعانت حاصل تھی۔ پنجاب سے گذرتی ہوئی سندھ کے علاقہ میں جا پہنچیں۔ اگرچہ سندھ کے اُمرا سے انگریزوں کی دوستی کا معاہدہ ہوچکا تھا۔ لیکن انگریزی فوجوں نے کھلم کھلا معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اثنائے راہ میں سندھ کے اکثر علاقوں کو لوٹا اور سندھ کے کئی اہم قلعوں پر بھی غاصبانہ قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد یہ فوجیں افغانستان میں داخل ہوگئیں۔ دوست محمد خاں انگریزوں کے بے اندازہ لشکر کا مقابلہ نہ کرسکا۔ وہ مقابلہ سے فرار ہوکر پہاڑی علاقہ میں چلا گیا۔ انگریزی فوجوں نے قندھار۔ غزنی اور کابل کو فتح کرتے کے بعد میر جعفر ثانی یعنی شاہ شجاع کو افغانستان کے تخت پر بٹھا دیا۔

غدار شاہ شجاع انگریزوں کیلئے مستقل مصیبت

انگریزوں نے شاہ شجاع کو تخت پر بٹھا تو دیا۔ مگر وہ بڑی مصیبت میں پھنس گئے اگر وہاں سے واپس آتے ہیں تو افغانستان کا تخت دشمنوں کے قبضہ میں چلا جاتا ہے۔ اور اگر رہتے ہیں تو کب تک رہیں۔ غرضکہ انگریز کمانڈر میک ناٹن کو مجبوراً اپنے دوست شاہ شجاع اور انگریز ریذیڈنٹ کی حفاظت کے لئے مع اپنے عظیم الشان

لشکر کے افغانستان میں قیام کرنا پڑا۔ اسی دوران میں ایک تازہ مصیبت یہ پیش آئی کہ شاہ شجاع چونکہ انگریزوں اور سکھوں کی مشترکہ کوشش سے افغانستان کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس لئے افغانوں میں شاہ شجاع کے خلاف عام بغاوت پھیل گئی۔ یہ بغاوت اس قدر وسیع تھی کہ تلوار کے زور سے اس کا دبانا ناممکن ہوگیا۔

اب انگریزوں نے فولاد کی بجائے زر سے کام لینا شروع کیا کروڑوں روپیہ تقسیم کرنا پڑا لیکن مصیبت یہ تھی کہ جہاں روپیہ کی تقسیم بند ہوئی۔ پھر بغاوت کھڑی ہو جاتی تھی۔ جب تک انگریزوں کے پاس روپیہ رہا برابر تقسیم کرتے رہے۔ آخر روپیہ ختم ہوگیا اور بغاوت بری طرح سے کھڑی ہوگئی اور ہر مورچہ پر انگریزوں کو شکستیں ہونے لگیں۔ اسی زمانہ میں خلافِ اُمید امیر دوست محمدؐ خاں خود انگریزوں کے پاس چلا آیا اور اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ تو انگریزوں نے اس کامیابی کو غنیمت سمجھا اور بڑے عزت و احترام کے ساتھ امیر دوست محمدؐ خاں کو کلکتہ بھیج دیا۔

انگریزوں کا خیال تھا کہ دوست محمدؐ خاں کے قابو میں آنے کے بعد افغانستان کی بغاوت دب جائے گی۔ لیکن یہ بغاوت دبنے کی بجائے ایسی بھڑکی کہ انگریز افغانستان سے مع اپنی فوج اور کٹھ پتلی بادشاہ کے فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔ امیر محمدؐ اکبر خاں جو دوست محمدؐ خاں کا نہایت ہی بہادر بیٹا تھا۔ اُس نے انگریزوں کی چاروں طرف سے ناکہ بندی کر کے اس بری طرح گھیرا کہ انگریزوں کی تمام توپیں اور سامان اُس نے چھین لیا۔ ایک ایک متنفس کو چُن چُن کر قتل کیا۔ بے چارہ شاہ شجاع بھی مارا گیا۔ صرف ایک ڈاکٹر بمشکل تمام زندہ بچ کر ۱۸۴۲ء میں جلال آباد پہنچا جس نے

انگریزوں کی تباہی اور بربادی کی یہ تمام داستان سنائی۔

لارڈ ایلن برو بھی افغانستان پر حملہ میں ناکام

لارڈ آک لینڈ نے جب فوجی طاقت کے بل پر شاہ شجاع کو افغانستان کے تخت پر لے جاکر بٹھایا تو لندن ہائی کمانڈ ایسا خوش ہوا کہ فوراً "آک لینڈ" کو "ارل آف آک لینڈ" کا خطاب عنایت کر دیا۔ لیکن جوں ہی لندن میں یہ خبر مشتہر ہوئی کہ شاہ شجاع کی چند روزہ بادشاہی کا ڈرامہ ختم ہوگیا ہے اور افغانوں نے ساری انگریز فوج کو مولی گاجر کی طرح کاٹ کر رکھ دیا ہے تو لندن ہائی کمانڈ اور انگلستان کے عوام آک لینڈ سے ایسے خفا ہوئے کہ اُسے واپس بُلا لیا۔ یعنی اس بے چارہ کو نہایت ذلت کے ساتھ استعفا دینا پڑا۔

لارڈ آک لینڈ کے بعد ۱۸۴۲ء میں لارڈ ایلن برو کو گورنر جنرل بنا کر ہندوستان روانہ کیا گیا۔ اگرچہ افغانستان کی لڑائی کی وجہ سے کمپنی کو تقریباً پندرہ کروڑ روپیہ کا گھاٹا اُٹھانا پڑا تھا۔ لیکن پھر بھی لارڈ ایلن برو نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ افغانوں سے ضرور بدلہ لے گا۔ اس کے علاوہ انگریزوں کے لئے افغانستان پر حملہ کرنا اس لئے بھی ضروری تھا۔ کیونکہ انگریزوں کی فوج کا ایک حصہ ابھی تک قندھار اور جلال آباد کے قلعوں میں گھرا ہوا تھا اور اُن کا مزید فوج کے پہنچے بغیر وہاں سے نکلنا ناممکن تھا۔ لیکن انگریز فوج کی بد دلی کا یہ عالم تھا کہ ہر سپاہی افغانستان کا نام سُنکر کانپ جاتا تھا۔ اسکے علاوہ افغانستان کے معرکہ میں انگریزوں کا سب سے بڑا ساتھی راجہ رنجیت سنگھ بھی مر چکا تھا۔ بہر حال انگریز اس وقت بڑی پریشانی میں تھے۔ نہ تو افغانستان پر حملہ ہی کر سکتے تھے۔ اور نہ افغانستان پر حملہ کرنے سے باز ہی رہ سکتے تھے۔

کئی ہفتے غور وخوض کرنے کے بعد آخر یہ طے پایا کہ جنرل پولک کی سرکردگی میں ایک بڑا لشکر افغانستان ضرور روانہ کیا جائے۔ چنانچہ پولک درّہ خیبر میں داخل ہو گیا۔ جلال آباد سے اُس نے محصور انگریزی فوج کو ساتھ لیا۔ اور کابل کی جانب بڑھا۔ قندھار کی انگریزی فوج بھی راستہ ہی میں آن ملی۔ اسکے بعد یہ بے پناہ لشکر کابل پہنچا۔ کابل کے بازار کو نذرِ آتش کیا۔ تھوڑی بہت تباہی غزنی میں مچائی اور قبل اس کے کہ افغانی مقابلہ پر آئیں۔ انگریز فوج وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور اُس نے اپنی سرحد میں آکر دم لیا۔ گویا انگریزوں کا انتقام صرف اسی حد تک تھا کہ کابل اور غزنی میں ذرا سا ہنگامہ مچا کر بھاگ آئیں۔ غرضکہ "جان بچی لاکھوں پائے خیر سے بدھو گھر کو آئے"۔ اس پر مزید بے غیرتی اور ڈھٹائی ملاحظہ ہو کہ انگریزوں نے اس ذلت آمیز پسپائی کے باوجود صرف کابل پہنچ جانے پر اپنی کامیابی کا خوب ڈھنڈورا پیٹا جس کا ہندوستان اور انگلستان میں خوب مذاق اُڑایا گیا۔

امیر دوست محمد خاں پھر افغانستان کا بادشاہ

انگریزوں نے روس کے فرضی خطرہ کے پیش نظر امیر دوست محمد خاں والئ افغانستان کے خلاف جو جنگ چھیڑی تھی۔ اُس پر انگریزوں کا تقریباً بیس بائیس کروڑ روپیہ خرچ آیا اور بیس ہزار سے زائد جانیں ضائع ہوئیں لیکن چار سال کی اس جد وجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں کو اپنی سابقہ غلطیوں کی تلافی کی غرض سے دوبارہ دوست محمد خاں سے گذارش کرنی پڑی کہ وہ افغانستان کا تخت وتاج سنبھالے۔ چنانچہ دوست محمد خاں دوبارہ افغانستان کا بادشاہ بن گیا۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ جس دوست محمد خاں کو یہ کہہ کر تخت سے اُترنے

پر مجبور کر دیا جاتا ہے کہ یہ ایک غاصب ہے، غدّار ہے، اُسی کو دوبارہ یہ کہہ کر تخت پیش کیا جاتا ہے کہ "آپ ہی افغانستان کے تخت کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ کیونکہ افغانستان کی رعایا آپکے علاوہ کسی کو افغانستان کے تخت پر دیکھنا نہیں چاہتی"۔ غرضکہ انگریزوں کو افغانستان کے معاملہ میں بڑی ذلت اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

سندھ پر غاصبانہ قبضہ

امیرانِ سندھ سے انگریزوں کا دوستانہ معاہدہ ہو چکا تھا۔ اور اس معاہدہ کی رُو سے یہ قرار پا چکا تھا کہ انگریزوں کے امیرانِ سندھ سے ہمیشہ دوستانہ تعلقات رہیں گے۔ لیکن جب افغانستان کی جنگ چھڑی تو یہ سارے دوستانہ اور پُرانے مُعاہدے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دئے گئے اور امیرانِ سندھ کو سابقہ معاہدوں کے خلاف مجبور کیا گیا کہ وہ دریا کے راستہ افغانستان کے خلاف جنگی سرگرمیوں میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کریں۔ اس کے علاوہ افغانستان کی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے سندھ کے بہت سے قلعوں پر بھی انگریزوں نے غاصبانہ قبضہ جما لیا۔ اور صرف یہی نہیں ہوا بلکہ امیرانِ سندھ کو ایک جدید معاہدہ کی رُو سے برطانوی امدادی فوج بنانے کے لئے تین لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرنے پر بھی مجبور کیا گیا۔

جنگ افغانستان میں ناکامی کے بعد انگریزوں کے لئے کسی نہ کسی سے افغانیوں کا انتقام لینا ضروری تھا۔ چنانچہ سندھیوں کو صدقہ کا بکرا بنایا گیا۔ اُمرائے سندھ پر یہ الزام لگایا گیا کہ اُنھوں نے افغانستان کی جنگ میں انگریزوں کے خلاف سازش کی تھی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ امیرانِ سندھ کی جانب سے سازش کا ہونا تو درکنار انھوں نے انگریزوں کی پے در پے بدعہدیوں کے باوجود تمام معاہدوں کی بڑی دیانتداری کے ساتھ پابندی کی تھی۔ لیکن

جب انگریز کی نظریں بدل جائیں تو ہر دیانتداری بے ایمانی قرار دی جا سکتی ہے۔ غرضکہ اس گناہ پر کہ امیرانِ سندھ نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ امیران سندھ کو یعنی امیر خیرپور۔ امیر حیدر آباد۔ امیر میرپور اور دوسرے اُمرائے سندھ کو حکم دیدیا گیا کہ وہ اپنی مملکت کے حصے کمپنی کے حوالے کر دیں۔ اور سندھ میں اپنے سکہ کی بجائے کمپنی کا سکہ جاری کریں۔

ظاہر ہے کہ ایسے بے جا مطالبات کو کون خوددار تسلیم کر سکتا ہے۔ امیرانِ سندھ نے اِن مطالبات کو ماننے سے انکار کیا۔ تو چارلس نیپیر نے ان کے خلاف فوج کشی شروع کر دی۔ سندھی اُمرا کے قلعے مسمار کر دیئے گئے۔ سندھی بیگمات کی بے آبروئی کی گئی۔ سندھی سپاہیوں کو خاک و خون میں تڑپایا گیا۔ سندھی عوام کو لوٹا گیا۔ اور اس تباہی اور بربادی کے بعد ۱۸۴۳ء میں سندھ پر بھی انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ ہو گیا۔ اس قبضہ کے بعد سندھی اُمرا کو جلاوطن کر دیا گیا۔ کیا دُنیا کی تاریخ میں اس سے بڑھ کر ظلم و جبر اور بدعہدی کا کوئی دوسرا واقعہ مل سکتا ہے۔

گوالیار کے خلاف بھی جنگ

انگریزوں کی یہ فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی کہ وہ موقعہ ملتے ہی اپنے ہی کئے ہوئے سابقہ معاہدے توڑ دیتے تھے۔ مہاراجہ گوالیار یعنی سندھیا۔ اگرچہ سابقہ معاہدہ کی رُو سے انگریزوں کا دوست بن چکا تھا لیکن مہاراجہ کے مرتے ہی انگریزوں نے مہاراجہ کے ورثا کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ راجہ کی بیوہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے لے پالک بچہ کے لئے انگریزوں کا پسندیدہ اتالیق مقرر کرے۔ رانی تو شاید تیار بھی تھی۔ لیکن اُمرائے ریاست اور فوجی سردار اِس کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔

اتنی سی بات پر جنگ چھڑ گئی۔ فوراً انگریزوں نے گوالیار پر فوج کشی شروع

کردی۔ گوالیاری سپاہی اگرچہ بہادری سے لڑے۔ مگر اُن کو شکست ہو گئی۔ رانی نے اطاعت قبول کرلی۔ ایلن برو نے نئی شرطیں پیش کردیں جن کی رُو سے ریاست کی فوج تیس ہزار سے گھٹا کر دس ہزار کر دی گئی۔ اور ریاست میں انگریز ریزیڈنٹ مقرر کر دیا گیا۔ گویا گوالیار کو بھی انگریزوں نے اپنے قبضہ میں لے لیا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ہی کمپنی کے بورڈ نے لارڈ ایلن برو کو لندن واپس بُلا لیا۔ کیونکہ بورڈ ایلن برو سے بھی بدظن ہو گیا تھا۔

سر ہنری ہارڈنگ کا دورِ حکومت

سر ہنری ہارڈنگ جس کو ۱۸۴۴ء میں گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ ایک مشہور سپاہی تھا جس نے کہ یورپ کی لڑائیوں میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ ایک سپاہی کو یہ عہدہ تفویض کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کیونکہ لندن ہائی کمانڈ کو یہ فکر ہو رہی تھی کہ کمپنی کے جگری دوست راجہ رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد اُن سکھوں کی طاقت کو جلد سے جلد توڑ دیا جائے جو پنجاب پر چھائے ہوئے تھے۔

سِکھوں کو مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد سے اُبھرنے کا موقعہ ملا تھا شروع میں تو ان کی تمام تر سرگرمیاں صرف لوٹ مار اور شہریوں کے قتلِ عام تک محدود رہیں۔ اس کے بعد انھوں نے رفتہ رفتہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں شمالی ہند میں بہت بڑی فوجی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ لیکن ۱۸۳۹ء میں راجہ رنجیت سنگھ کے فوت ہونے کے بعد پنجاب میں پھر بدامنی اور لاقانونی کا دور دورا شروع ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر سکھ سردار یہ چاہتا تھا کہ پنجاب میں اُس کا اقتدار قائم ہو جائے۔ چنانچہ

حصول اقتدار کے لئے اس خانہ جنگی نے سارے پنجاب میں ابتری پیدا کر دی تھی۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ خالصہ یعنی سکھ وزارت فوج پر قابو پانے میں ناکام ہو گئی۔ چنانچہ سکھ فوج نے بے ترتیبی کے ساتھ اِدھر اُدھر حملے شروع کر دئے۔

سکھوں اور انگریزوں میں جنگ

سکھ فوج نے جہاں دوسرے علاقوں میں دست درازی شروع کر دی تھی۔ وہاں سکھ ستلج پار کر کے انگریزی علاقہ میں بھی داخل ہو گئے اور اس طرح سکھوں اور انگریزوں کی پہلی لڑائی ۱۸۴۵ء میں چھڑ گئی۔ سکھوں اور انگریزوں کا پہلا مقابلہ مدکی میں ہوا۔ اس جنگ میں سکھ سپاہیوں کی تعداد سولہ ہزار تھی۔ سکھوں نے بڑی جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اس معرکہ میں اگرچہ سکھوں کو شکست ہوئی مگر انگریزوں کو بھی بے حد نقصان اٹھانا پڑا۔ ایسر رابرٹ سیل اسی معرکہ میں مارا گیا تھا۔

انگریزوں نے اس کے بعد فیروز پور کے سکھ کیمپ پر حملہ کر دیا جس سے سکھوں کو بے حد نقصان پہنچا۔ پھر کئی مہینے کے بعد ۱۸۴۶ء میں علی وال اور سبھراؤں میں سکھوں اور انگریزوں میں خوفناک جنگ ہوئی۔ جس میں انگریزوں کو فتح اور سکھوں کو شکست ہو گئی۔ شکست کے بعد سکھوں نے عہد نامۂ لاہور پر دستخط کر دئے۔ جس کی رُو سے سکھوں کو بیاس تک کا علاقہ انگریزوں کو دینا پڑا۔ اپنی فوج کی تعداد کم کر دینی پڑی۔ انگریز ریزیڈنٹ لاہور میں متعین کر دیا گیا۔ قیام امن کے نام پر لاہور میں انگریزی فوج بھی مسلط کر دی گئی۔ ڈیڑھ کروڑ روپیہ سکھوں کو تاوانِ جنگ ادا کرنا پڑا۔ سکھوں کے پاس چونکہ صرف پچاس لاکھ روپیہ تھا۔ اس لئے انھوں نے بقیہ ایک کروڑ روپیہ کے بدلے جموں اور کشمیر کا علاقہ

انگریزوں کو دیدیا۔ انگریزوں نے یہ علاقہ ایک کروڑ روپیہ میں ڈوگرا سردار گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ دیا۔ انگریزوں نے گلاب سنگھ کو جموں اور کشمیر کا راجہ بنا دیا۔ نوعمر راجہ دلیپ سنگھ کو انگریزوں نے سکھوں کا راجہ تسلیم کر لیا۔ اور اس نوعمر راجہ کی نگران راجہ رنجیت سنگھ کی بیوہ رانی مقرر ہوئی۔

سر ہنری ہارڈنگ کو سکھوں پر فتح حاصل کرنے کے انعام میں لارڈ کا خطاب عطا ہوا۔ لارڈ ہارڈنگ چاہتا تھا کہ پنجاب کا تمام علاقہ انگریزوں کے قبضے میں آجائے۔ مگر حالات ابھی سازگار نہ تھے۔ اس لئے ہارڈنگ نے اپنی جدوجہد کو اندرونی اصلاحات تک محدود کر دیا۔ اس کے بعد ۱۸۴۸ء میں وہ لندن واپس چلا گیا۔

لارڈ ڈلہوزی کا دورِ حکومت

لارڈ ڈلہوزی کا دورِ حکومت اس اعتبار سے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ کہ اس گورنر جنرل نے ۱۸۴۸ء میں چارج لینے کے بعد کمپنی اور والیانِ ملک کے پرانے معاہدات کی جس بُری طرح سے خلاف ورزی کی ہے۔ وہ آپ ہی اپنی نظیر ہے۔ یُوں تو تقریباً ہر انگریز گورنر جنرل کا یہی اُصول رہا ہے یعنی ان میں سے جس کسی کو بھی موقعہ ملا۔ اُس نے اپنے پیشرووں کے معاہدات کو ردّی کی ٹوکری کی نذر کر دیا لیکن لارڈ ڈلہوزی اِس معاملہ میں سب سے آگے تھا۔ اگر اسے بدعہدی اور بدمعاملگی کا مجسّمہ قرار دیا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

سکھوں سے دوسری جنگ اور پنجاب کا الحاق

لارڈ ڈلہوزی کا دورِ حکومت کا سب سے اہم واقعہ سکھوں سے دوسری جنگ اور پنجاب کا الحاق ہے۔ سکھوں سے دوسری جنگ کی وجہ یہ ہوئی کہ لاہور کے انگریز ریزیڈنٹ نے رفتہ رفتہ پنجاب

کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور تمام اہم عہدوں پر انگریز مقرر کر دئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ خالصہ یعنی سکھ وزارت ناکارہ ہو کر رہ گئی اور اس سے سکھوں میں شدید ناگواری پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ صرف یہی نہیں ہوا بلکہ ملتان کے سکھ حاکم سردار مولراج سے بالجبر عہدہ چھیننے کے لئے دو انگریز لاہور سے روانہ کئے گئے انگریزوں کے خلاف چونکہ عام نفرت پھیل چکی تھی۔ اس لئے ملتان کے عوام نے ان انگریزوں پر حملہ کر کے قتل کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مولراج نے بھی بغاوت برپا کر دی اور بغاوت رفتہ رفتہ پنجاب کے اکثر حصوں میں پھیل گئی۔ اس ہنگامہ کی ابتدا اگرچہ ملتان کے واقعہ سے شروع ہوئی تھی لیکن یہ کہا گیا کہ یہ سب کچھ رانی اور سکھ سرداروں کے ایما سے ہوا ہے۔

اس اتفاقی ہنگامہ اور فساد کو بہانہ بنا کر ریزیڈنٹ لاہور نے سکھوں کے خلاف سازش کا ایک نیا ڈھونگ کھڑا کر دیا۔ اور اس سازش کے الزام میں بڑے بڑے سکھ سرداروں نیز راجہ رنجیت سنگھ آنجہانی کی بیوہ کو بھی گرفتار کر کے بنارس جلاوطن کر دیا جس سے سکھوں میں ایک آگ سی لگ گئی۔

سکھوں کے علاوہ غیر سکھوں میں بھی انگریزوں کے اس جارحانہ طرزِ عمل نے ایک نفرت پیدا کر دی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ پٹھانوں نے خیبر پاس سے گذر کر سکھوں کی امداد کے لئے پنجاب کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ انگریز جو پہلے ہی سے مقابلہ کے لئے تیار تھے وہ بھی میدان میں آ گئے۔

انگریزوں اور سکھوں کا پہلا مقابلہ نومبر ۱۸۴۸ء میں راوی کے پار رام نگر کے مقام پر ہوا۔ لارڈ گف ایک سو توپوں اور بیس ہزار فوج کے ساتھ سکھوں پر ٹوٹ پڑا۔ سکھوں کو شکست ہو گئی۔ مگر انگریزوں کو بھی بے حد نقصان اٹھانا پڑا۔ دوسرا مقابلہ ملتان میں ہوا۔ اس جنگ میں سکھوں کا بے حد نقصان ہوا۔ اور مول راج نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ یہ مقابلہ ۳ جنوری ۱۸۴۹ء کو ہوا تھا۔ اس

کے بعد جلیاں والہ اور گجرات میں سکھوں اور انگریزوں میں شدید جنگ ہوئی جس میں بے اندازہ سکھ مارے گئے۔

اس لڑائی کے بعد سکھوں کی طاقت بالکل ٹوٹ گئی۔ مگر لارڈ ڈلہوزی اب بھی چین سے نہ بیٹھا۔ اُس نے جنرل گلبرٹ کو حکم دیدیا کہ سکھ جہاں اور جس جگہ ملیں اُن کا صفایا کر دیا جائے۔ غرضکہ بڑی بے دردی کے ساتھ سکھوں کا قتلِ عام کیا گیا۔

سکھوں کو کچلنے اور اُن پر کامل فتح پانے کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب کے کمسن مہاراجہ دلیپ سنگھ کو تخت سے معزول کر دیا۔ پنجاب کو برطانوی علاقہ میں شامل کر لیا گیا۔ اور راجہ کا وظیفہ ایک ہزار پونڈ ماہوار مقرر کر دیا۔ جو بعد کو بڑھا کر ۲۵ ہزار پونڈ سالانہ کر دیا گیا تھا۔ راجہ دلیپ سنگھ کو معزول کرنے کے سلسلہ میں ڈلہوزی پر یہ الزام ہے کہ ڈلہوزی نے راجہ کی ذاتی املاک جائداد محلات اور جواہرات یہاں تک کہ قیمتی برتنوں تک پر قبضہ جما لیا تھا۔

انگریزوں کا برما پر قبضہ

پنجاب کے الحاق کے تین سال بعد ۱۸۵۲ء میں لارڈ ڈلہوزی نے سمندر اور خشکی کے راستہ سے برما پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس حملہ کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ برما کے راجہ کا سلوک اُن یورپینوں کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ جو برما میں آباد تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انگریز جو برما کی پہلی لڑائی کے نتائج سے مطمئن نہیں تھے اُنھوں نے انگریزوں کے ساتھ برمیوں کی بدسلوکی کو بہانہ بنا کر برما پر چڑھائی کر دی۔ اور اس چڑھائی کے بعد رنگون۔ مرتبان۔ پروم۔ پیگو اور سارے جنوبی برما کو فتح کر کے اُسے برطانوی مقبوضات میں شامل کر لیا۔ چنانچہ یہ علاقہ بعد کو ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوا۔

لارڈ ڈلہوزی کی سیاست کے نئے شکار

انگریزوں نے جن ہندوستانیوں کے ملک اور سرزمین پر عیاری کے ساتھ قبضہ جمایا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی چاہتا تھا کہ اس ملک کے باشندوں میں سے کوئی برائے نام بھی ہندوستان کا حاکم نہ رہے۔ چنانچہ اُس نے نیا اُصول نکالا کہ اگر کوئی والئ ملک لاولد مر جائے تو اُس کی ریاست برطانوی مقبوضات میں شامل کر لی جائے۔ حالانکہ اس سے قبل یہ اُصول طے پا چکا تھا کہ والئ ملک کے لاولد مرنے کی صورت میں کسی ریاست پر بھی انگریز قبضہ نہیں جمائیں گے۔ بلکہ متوفی راجہ یا نواب کے قریب ترین عزیز کو تخت پر بٹھایا جائے گا۔ لیکن لارڈ ڈلہوزی جو انگریزوں کے فائدہ کے لئے ہر معاہدہ کو ردّی کی ٹوکری کی نذر کر دینا ضروری سمجھتا تھا۔ اُس نے نہایت عیاری کے ساتھ بہت سے والیانِ ملک کے مرنے کے بعد اُن کی ریاستوں پر قبضہ جما لیا۔

ستارہ کا راجہ جب مرا تو وہ لاولد تھا۔ لیکن اُس کا لے پالک لڑکا موجود تھا۔ ڈلہوزی نے اُسے وارث تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے ستارہ کو انگریزی علاقہ میں شامل کر لیا۔ اسی طرح ناگپور۔ جھانسی سنبل پور۔ جیت پور۔ بگھاٹ وغیرہ کو برطانوی علاقے کے ساتھ ملحق کر لیا گیا۔

برار اور اودھ کا الحاق

لارڈ ڈلہوزی نے بغیر لڑے بھڑے ہندوستانی ریاستوں کو ہضم کرنے کی جو پالیسی شروع کی تھی۔ اُس کو کمپنی کے لنڈن ہائی کمانڈ نے بے حد پسند کیا۔ اور پسند کرنا بھی چاہیے تھا کیونکہ جنگ کے مصارف کے بغیر انگریزوں کو فتوحات پر فتوحات حاصل ہو رہی تھیں۔

لندن سے حیدر آباد اور اودھ کی جانب اشارہ ہوا۔ لارڈ ڈلہوزی نے فوراً حیدر آباد پر ہاتھ رکھ دیا۔ ریاست حیدر آباد کے لئے "لاولد" ہونے کا عذر تو تھا نہیں اس لئے نیا بہانہ تلاش کیا گیا۔ چنانچہ ریاست پر الزام لگایا گیا کہ ریاست کی اقتصادی حالت اس قدر نازک ہے کہ تنخواہیں بھی ادا نہیں ہوسکتیں۔ نیز نواب پر الزام عائد کیا گیا کہ اس نے سارا کام وزراء پر چھوڑ رکھا ہے۔

ڈلہوزی کے نزدیک یہ عذرات مسلمانوں کی سب سے بڑی ریاست کو ہضم کر جانے کے لئے بالکل کافی تھے۔ لیکن ڈلہوزی کو اندیشہ ہوا کہ کہیں حیدر آباد پر ہاتھ ڈالنے سے کوئی نیا ہنگامہ نہ کھڑا ہو جائے۔ اس لئے برطانوی امدادی فوج کے اخراجات کے لئے ڈلہوزی نے صرف برار ہی لینے پر اکتفا کیا۔ اور برار نظام کو پھر کبھی نہ مل سکا۔ یہ انگریزوں کا اُس نظام کے ساتھ سلوک تھا جس نے کہ ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام کے لئے وطن سے غداری کرتے ہوئے سب سے زیادہ انگریزوں کو مدد دی تھی۔

برار کے ہضم کرنے کے دو ڈھائی سال بعد ڈلہوزی نے اُس اودھ کو بھی ختم کر دیا جس کے نواب نے انگریز کی محبت میں سرشار ہو کر وطن اور بادشاہ سب سے غداری کی تھی۔ اودھ کے نواب واجد علی شاہ پر بدنظمی اور بدانتظامی کا الزام لگایا گیا۔ چنانچہ ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ بھیجدیا گیا۔ اور تمام پرانے معاہدے ردی کی ٹوکری میں ڈال دئے گئے۔ نواب اودھ چونکہ مغلیہ حکومت کا وزیر بھی تھا۔ اس لئے اُس کی معزولی نے عوام میں سخت ناگواری پیدا کر دی تھی۔ اور اسی ناگواری کا نتیجہ ۱۸۵۷ء کا وہ تاریخی غدر تھا جس نے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی بنیادوں کو ہلا ڈالا۔

وظائف اور خطابات بھی ختم

ڈلہوزی کو ہندوستانی حکمرانوں سے

اس قدر نفرت تھی کہ وہ ان کے نام نہاد خطابات اور وظائف تک کو گوارا کرنے کے لیئے تیار نہ تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے کرناٹک کے اُس نواب سے نوابی کا خطاب چھینا گیا جس کے آباواجداد نے ماہی گیروں کی قوم کی سرپرستی کرکے اُسے ہندوستان کا بادشاہ بنادیا تھا۔ راجہ تنجور سے بھی راجہ کا خطاب واپس لے لیا گیا۔ باجی راؤ پیشوا کے مرنے کے بعد اُس کے ورثا کا وظیفہ بند کردیا گیا۔ اور دہلی کے نام نہاد مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو بھی یہ اطلاع دے دی گئی کہ "دہلی کا قلعۂ معلّٰی اور بادشاہی کا خطاب صرف آپ کے دم تک باقی ہے۔ آپ کے مرنے کے بعد نہ قلعۂ معلّٰی رہے گا۔ نہ بادشاہی کا برائے نام خطاب۔ ہاں وظیفہ حسب ضرورت جاری کردیا جائے گا" یہ تھا ڈلہوزی کا ہندوستانی والیانِ ملک اور بادشاہوں کے ساتھ ذلت آمیز طرزِ عمل۔

ڈلہوزی کے دورِ حکومت میں چونکہ برطانوی حکومت تقریباً پورے ہندوستان پر چھا چکی تھی اسلیئے اُسے ڈاک خانہ۔ محکمۂ تعلیم اور انتظامی معاملات میں بھی کچھ نہ کچھ اصلاحات کرنی پڑیں۔ لیکن ان اصلاحات کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔ ہندوستان میں پہلی ریلوے لائن ۱۸۵۳ء میں بمبئی اور تھانہ کے درمیان ڈلہوزی کے زمانہ ہی میں بنائی گئی تھی۔ اس ریلوے لائن کی لمبائی کُل بیس میل تھی۔ لارڈ ڈلہوزی ہندوستان میں ۱۸۴۸ء سے لے کر ۱۸۵۶ء تک آٹھ سال رہا اور اس نے کلایو اور ہیسٹنگز کے دیرینہ خواب کو سچا کرکے دکھا دیا۔

لارڈ کیننگ کا دورِ حکومت

لارڈ ڈلہوزی اور اُس کے پیش رو گورنر جنرلوں نے اپنی بد معاملگی بد عہدی اور ظلم وستم سے ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت وحقارت کی آگ کو بڑی طرح بھڑکا دیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کا ہر باشندہ بلا امتیاز مذہب و

ملت انگریز کو اپنے لئے ایک مستقل لعنت تصور کرنے لگا تھا۔ ہندوستان کے وہ والیانِ ملک جنہوں نے شروع میں ابنائے وطن کے ساتھ غداری کرتے ہوئے انگریزوں کی سب سے زیادہ مدد کی تھی وہ بھی اپنے کئے پر پشیمان تھے۔ غرضکہ انگریزوں نے خود اپنے ہی ناروا سلوک سے سارے ہندوستان کو اپنے خلاف مشتعل کر دیا تھا۔

اس نفرت و حقارت کی فضا میں لارڈ کیننگ جب ۱۸۵۶ء میں گورنر جنرل کی حیثیت سے ہندوستان پہنچا تو اُس نے یہ بات بری طرح محسوس کی کہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف نفرت و حقارت کا بیج بری طرح پھوٹ چکا ہے۔ کیننگ کی رائے تھی کہ محض طاقت اور قوت کے بل پر ہندوستان کے زہریلے عناصر دبے ہوئے ہیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ آگ جو ہندوستان میں اندر اندر سلگ رہی ہے۔ نہ جانے کب کوہ آتش فشاں بن کر پھٹ پڑے۔ غرضکہ کیننگ ہندوستان کے حالات سے بالکل غیر مطمئن تھا۔ چنانچہ لارڈ کیننگ کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ اُسے ہندوستان آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ہندوستان کی فوج میں بغاوت پیدا ہو گئی جو ۱۸۵۷ء کے غدر یا ہندوستان کی جنگِ آزادی کے نام سے مشہور ہے۔

ناگواری کے بنیادی اسباب

قبل اس کے کہ ہم ۱۸۵۷ء کے خونیں حادثات کا ذکر کریں۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن بڑے بڑے بنیادی اسباب پر روشنی ڈال دیں۔ جن کی بنا پر ہندوستان میں غدر کا ہنگامہ برپا ہوا۔ یہ اسباب مندرجہ ذیل تھے۔

عام نفرت:۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو اپنے سے کم درجہ تصور کر کے اور اُن کے ساتھ غیر شریفانہ سلوک اختیار کر کے اپنے خلاف عام نفرت اور حقارت کے جذبات ہندوستانیوں کے دلوں میں پیدا کر دئے تھے۔ نسلی امتیاز

نے اس نفرت کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔

مغل بادشاہ کے ساتھ ناروا سلوک:۔ مغل بادشاہ اگرچہ نام کا بادشاہ رہ گیا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس سے مسلمانوں کو خصوصاً اور دیگر اقوام کو عموماً ایک خاص قلبی تعلق باقی تھا۔ چنانچہ جب اُس کی اولاد کو قلعۂ معلےٰ میں رہنے کے حق سے محروم کیا گیا اور بادشاہی کا خطاب چھیننے کا بھی اعلان ہو گیا تو شاہ پسندوں میں بُری طرح سے غصہ اور ناگواری کی لہر دوڑ گئی۔ بادشاہ سے اس لئے بھی عوام کو ہمدردی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ اُسے مظلوم اور انگریزوں کا قیدی تصور کیا جانے لگا تھا۔

والیانِ ملک سے بدسلوکی:۔ ہندوستان کے عوام اور فوجی سپاہی جب یہ دیکھتے تھے کہ انگریز ایک طرف ہندو راجاؤں کی تذلیل کر رہے ہیں۔ تو ان کا خون رگوں میں جوش کھا کر رہ جاتا تھا۔ اور وہ اسے اپنی قومی ذلت تصور کرتے تھے۔

نواب اودھ کی معزولی:۔ نواب اودھ واجد علی شاہ جو حکومتِ مغلیہ کا وزیر اعظم بھی تھا۔ جب انگریزوں نے اُسے تخت و تاج سے محروم کرنے کے بعد اودھ سے نکال دیا تو مسلمانوں اور فوجی سپاہیوں میں خصوصاً اور اودھ کے عام باشندوں میں عموماً انگریزوں کے خلاف سخت ناگواری پھیل گئی۔

مرہٹوں میں غصہ:۔ مرہٹہ پیشوا کے متبنّٰی کو وظیفہ سے محروم کر کے اور ناگپور و ستارہ کی مرہٹہ ریاستوں پر غاصبانہ قبضہ جما کر انگریزوں نے مرہٹوں اور ہندوؤں کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ چنانچہ مرہٹوں اور ہندوؤں میں انگریزوں کی اس روش سے بے حد نفرت بڑھ گئی تھی۔

جھانسی کی رانی کے ساتھ زیادتی:۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی کو متبنّٰی بنانے کے جائز حق سے محروم کر کے ایک بڑے طبقہ کو انگریزوں نے اپنا دشمن اور مخالف بنا لیا تھا۔ رانی جھانسی چونکہ ایک بے سہارا عورت تھی۔ اس لئے اُس سے

ہندوستان کے ہندو مسلمان اور جملہ اقوام کو یکساں ہمدردی تھی۔

امیرانِ سندھ پر ظلم:۔ امیرانِ سندھ کو تخت و تاج سے محروم کرنے کے لئے انگریزوں نے ان امیروں اور ان کی بیگمات پر جو زیادتیاں اور ظلم کئے تھے اُن کی بنا پر سندھیوں اور مسلمانوں میں خصوصاً اور دوسرے ہندوستانیوں میں عموماً۔ انگریزوں کے خلاف انتہائی نفرت پھیل چکی تھی۔

جنوبی ہند میں ناگواری:۔ جنوبی ہند میں نواب کرناٹک اور راجہ تنجور کو نواب اور راجہ کے خطابات سے محروم کرکے اور نظام سے برار چھیننے کے بعد جنوبی ہند کے ایک بڑے طبقہ کو بھی انگریزوں نے اپنا مخالف بنا لیا تھا۔

پادریوں کی سرگرمیاں:۔ انگریزوں کے خلاف ناگواری کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ہندوستان میں عیسائی پادریوں کی سرگرمیاں بے حد بڑھ گئی تھیں۔ ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کو کھلم کھلا عیسائی بنایا جا رہا تھا انگریزی تعلیم اور پادریوں کی اس غلط روش سے ہندو اور مسلمان دونوں یہ سمجھنے لگے تھے کہ انگریزوں کی وجہ سے اُن کا مذہب خطرہ میں پڑ گیا ہے۔

فوجی سپاہیوں میں غصہ:۔ فوجی سپاہی جن کا عوام سے کہیں زیادہ ہندوستان کے والیان ملک سے تعلق اور رابطہ تھا۔ اوّل تو وہ انگریزوں کے ہاتھوں والیانِ ملک کی تذلیل کی وجہ سے بگڑے ہوئے تھے۔ دوسرے خود ان فوجی سپاہیوں کے ساتھ انگریزوں کا سلوک نہایت ہی ذلت آمیز تھا۔ چنانچہ ویلور کے احتجاج کی بناء پر انگریزوں نے ان کو گولیوں سے اُڑا دیا تھا۔ بنگال کے سپاہیوں نے ملک سے باہر جانے کے لئے جب مزید الاؤنس کا مطالبہ کیا تھا اور جائز سلوک کی خواہش کی تھی تو ان کے جائز مطالبات کو بغاوت قرار دیتے ہوئے ہندوستانی سپاہیوں کو موت کے گھاٹ

اُتار دیا تھا۔

فوجی سپاہیوں کی فاقہ کشی:۔ ہندوستانی سپاہیوں کے دل اس چیز سے بھی زخمی تھے کہ اُن ہی کے ملک کے روپے سے گورے سپاہیوں کو تو دس گنی تنخواہیں دی جاتی ہیں، اُن کی آسائش کے لئے شاہانہ انتظامات کئے جاتے ہیں۔ مگر ہندوستانی سپاہیوں کو خون بہانے کے معاوضہ میں روٹی بھی نہیں دی جاتی۔

چربی لگے ہوئے کارتوس:۔ ایسی حالت میں جبکہ فوجیوں میں انگریزوں کے خلاف عام ناگواری پھیلی ہوئی تھی۔ اور یہ بھی شبہ عام تھا کہ انگریز ہندو اور مسلمانوں کے مذہب کے دشمن ہیں۔ فوج میں چربی لگے ہوئے کارتوسوں کو رواج دینے کی کوشش کی گئی۔ ہندوستانی سپاہیوں کو چربی لگے ہوئے کارتوسوں کو دانت سے توڑنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ مُردار چربی خواہ وہ کسی جانور کی کیوں نہ ہو۔ نہ ہندو منھ لگا سکتے تھے نہ مسلمان۔ چنانچہ ایمان ودھرم کے تحفظ کے لئے جب ہندوستان کے خوددار سپاہیوں نے کارتوسوں کو مُنھ لگانے سے انکار کردیا تو ان کو باغی قرار دیدیا گیا۔ اس کے علاوہ فوجی سپاہیوں میں یہ افواہ بھی پھیل گئی تھی کہ ان کارتوسوں میں ہندو اور مسلمانوں کا مذہب برباد کرنے کے لئے سور اور گائے کی چربی دیدہ ودانستہ لگائی گئی ہے۔ اس افواہ کی بنا پر فوجی سپاہیوں میں بغاوت کے آثار پوری طرح پیدا ہو گئے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی

مندرجۂ بالا اسباب کی بنا پر انگریزوں کے خلاف نفرت وحقارت کی آگ پوری طرح پھیل چکی تھی۔ فوجی سپاہی خصوصیت کے ساتھ انگریزوں کی زیادتیوں سے تنگ آچکے تھے۔ اور وہ اس انتظار میں تھے کہ وقت اور موقع آنے پر

وطن کی آزادی کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک قربان کردیں۔

اندر ہی اندر سپاہیوں میں کانفرنسیں اور مشاورت کی مجلسیں منعقد ہونے لگی تھیں۔ اور فوجی سپاہی ملک میں انقلابی جنگ کے لئے بالکل تیار اور آمادہ تھے۔ چنانچہ ملک میں جابجا فوجی بغاوتیں شروع ہوگئی تھیں۔ چنانچہ کلکتہ کے قریب بارک پور کی فوجی چھاؤنی میں ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت برپا کردی تھی۔ جسے انگریز نے فوجی طاقت سے دبا دیا۔ اسی طرح بہرام پور کی چھاؤنی میں بھی ہندوستانی سپاہیوں نے پریڈ کرنے سے انکار کردیا تھا جس پر اُن کو گولیوں سے اُڑا دیا گیا۔ انبالہ چھاؤنی میں بھی ہندوستانی سپاہی بغاوت پر آمادہ ہوگئے تھے۔ لیکن انگریز نے اس بغاوت کو بھی پوری طاقت سے دبا دیا۔ غرضکہ ملک کے مختلف حصوں میں انگریزوں کے خلاف انقلابی تحریک جاری ہوچکی تھی۔

فوجی سپاہیوں کو اپنی اس انقلابی جنگ کے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ انگریزوں نے جس طرح کہ خود ہی ہندوستان میں نفرت اور حقارت کا بیج بویا تھا۔ اُسی طرح انھوں نے اپنے جارحانہ اور متشددانہ طرزِ عمل سے نفرت اور حقارت کی بارود میں خود ہی آگ لگادی۔ چنانچہ یہ جاننے کے باوجود کہ فوج کے تمام ہندوستانی سپاہیوں میں چربی لگے ہوئے کارتوسوں سے سخت ناگواری پھیلی ہوئی ہے۔ ۶ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے سفید فام فوجی افسروں نے دیسی سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ چربی لگے ہوئے کارتوسوں کو دانت سے توڑیں۔ چنانچہ ۸۵ سپاہی خوددار سپاہیوں نے کارتوسوں کو دانت سے توڑنا تو کیا چھونے سے بھی انکار کردیا۔

دیسی سپاہیوں کی یہ "بغاوت" بھلا انگریز کیونکر برداشت کرسکتا تھا چنانچہ ان

پچاسی محبانِ وطن کو بدترین مجرم قرار دیدیا گیا۔ فوجی عدالت میں انھیں پیش کیا گیا۔ فوجی نشانات ان سے چھین لیئے گئے۔ ان کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے پشت کی طرف سے ان کی وردیاں پھاڑ دی گئیں مجمع عام میں ان کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنانے کے بعد جیل کی کوٹھریوں میں بند کر دیا گیا۔

انگریزوں کے اس ظالمانہ اور جابرانہ سلوک نے میرٹھ کی دیسی فوج میں خودداری کے جذبات کو بیدار کر دیا۔ چنانچہ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے ہندوستانی سپاہیوں نے اس ذلت کا جواب اس طرح دیا کہ انھوں نے کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ ذراسی دیر میں بے شمار سفید رنگ کے سول اور فوجی افسر اور اُن کے متعلقین قتل کر دئیے گئے۔ اس کے بعد انقلاب پسند اُس جیل کی طرف بڑھے۔ جہاں ۸۵ محبانِ وطن قید تھے۔ جیل کے دروازے توڑ دئیے گئے۔ محبانِ وطن کو بند و سلاسل سے آزاد کیا گیا۔ ہر سرکاری عمارت کو آگ لگا دی گئی۔ تار کاٹ دئیے گئے۔ اور اس کے بعد انقلاب پسند "دہلی چلو۔ دہلی چلو" کا نعرہ لگاتے ہوئے دہلی کی جانب بڑھے۔ انقلاب پسند سپاہیوں کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں عوام بھی اس جنگِ آزادی میں شامل ہو گئے تھے۔

دہلی اور دوسرے شہروں میں ہنگامہ

میرٹھ کے انقلاب پسند ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کی صبح کو دہلی پہنچ گئے۔ دہلی کے سفید فام فوجی افسروں نے دیسی سپاہیوں کو ان پر گولی چلانے کا حکم دیا تو ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے بھائیوں کو خاک و خون میں تڑپانے سے انکار کر دیا۔ غرضکہ دہلی میں بھی انقلابی ہنگامہ برپا ہو گیا ریزیڈنٹ قتل ہوا۔ کپتان ڈگلس مارا گیا۔ بینک لوٹ لیا گیا۔ گرجا کو آگ لگا دی گئی۔ انگریز عورتیں۔ مرد اور بچے جہاں ملے تہ تیغ کر دئیے گئے۔ اور کمپنی

کی حکومت کی بجائے مغل بادشاہ کے انکار کے وجود۔ بہادر شاہ کی بادشاہی کا اعلان کر دیا گیا۔ چاروں طرف سے انگریز فوجیں اس انقلابی تحریک کو کچلنے کے لئے دہلی کی طرف دوڑ پڑیں۔ لیکن انقلاب پسندوں نے ان کو پسپا کر دیا۔ خوب گھمسان کی لڑائی ٹھن گئی۔

دہلی کے بعد کانپور میں بھی محبانِ وطن میدان میں آ گئے۔ انقلابیوں کی رہنمائی پیشوا کا متبنیٰ نانا صاحب کر رہا تھا۔ یہاں بھی سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دی گئی۔ تار کاٹ دیئے گئے۔ فوجی اور سول افسر چن چن کر قتل کئے گئے انگریزوں کا باقاعدہ طور پر قتلِ عام شروع ہو گیا۔

لکھنؤ میں انقلاب پسندوں نے واجد علی شاہ کے بیٹے کو اودھ کے تخت پر بٹھا دیا۔ دیسی فوج نے انگریزوں سے انتقام لینا شروع کیا۔ جہاں اور جس جگہ کوئی انگریز ملا اسے قتل کر دیا گیا۔ غرضکہ لکھنؤ بھی دہلی اور کانپور سے پیچھے نہیں رہا۔ اسی طرح بریلی، شاہجہانپور، مراد آباد، اور بدایوں میں بھی انگریزوں کا بری طرح قتلِ عام ہوا۔ اور ان مقامات پر انگریزی حکومت ختم کر دی گئی۔

وسط ہند اور بندیلکھنڈ میں انقلاب پسندوں کی رہنمائی جھانسی کی بہادر رانی لکشمی بائی کر رہی تھی۔ نانا صاحب کا سپہ سالار تانتیا ٹوپی رانی کی فوج کی کمان کر رہا تھا۔ رانی لکشمی بائی اور کمار سنگھ نے بڑی بہادری کے ساتھ انگریز فوجوں کا مقابلہ کیا۔ اور یہ دونوں محبانِ وطن انگریزوں سے لڑتے ہوئے وطن پر قربان ہو گئے۔

انقلاب پسندوں کی مایوسی

انگریزوں کے خلاف ملک کے کونے کونے میں جو نفرت و

حقارت پھیلی ہوئی تھی۔ اُسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے انقلاب پسندوں کا خیال تھا کہ انقلاب کی یہ آگ رفتہ رفتہ سارے ہندوستان میں پھیل جائے گی۔ لیکن انقلاب پسندوں کو یہ دیکھ کر بے حد مایوسی ہوئی کہ میرٹھ، دہلی، کانپور، لکھنؤ، بریلی شاہجہانپور، مراد آباد اور وسط ہند کے بعض علاقوں سے آگے یہ انقلابی تحریک نہ بڑھ سکی۔

انقلابی تحریکیں اُسی وقت کامیاب ہوتی ہیں جب عوام بھی ان میں شامل ہو جائیں۔ لیکن وہ عوام جن کی جرأت اور اخلاق کو گذشتہ ایک صدی کے اندر انگریز نے کچل دیا تھا۔ جو زبان سے تو انگریز کی ہر وقت مخالفت کرتے تھے۔ لیکن عملی طور پر اُس کے مقابلہ پر آتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اُن سے اس انقلابی تحریک میں حصّہ لینے کی کیا اُمید کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ عوام چھپے ہوئے اپنے گھروں میں بیٹھے رہے۔ صرف چند ہزار سپاہی اور چند ہزار محبانِ وطن جان کی بازی لگاتے رہے اور وہ بھی صرف چند شہروں میں حالت یہ تھی کہ جہاں یوپی کے محبانِ وطن اور سپاہی وطن کی آزادی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تُلے ہوئے تھے۔ وہاں پنجاب۔ بہار، بنگال، بمبئی، مدراس اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی جانب سے انگریزوں کو وفاشعاری کا یقین دلایا جا رہا تھا۔

دہلی انقلاب پسندوں کا آخری مرکز

عوام کی اس بے حسی کے باوجود انقلابی برابر جنگ کرتے رہے۔ اُنھوں نے ہر چہار طرف سے مایوس ہونے کے بعد دہلی میں سمٹ سمٹا کر دہلی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ انقلابیوں کی ہمت وجرأت اور استقلال کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ باوجودیکہ نہ اُن

کے پاس روپیہ تھا نہ خوراک تھی۔ اور نہ سامان حرب تھا۔ لیکن پھر بھی یہ مسلسل ساڑھے چار مہینے تک انگریزوں کی اُس مضبوط حکومت سے ٹکر لیتے رہے۔ جس نے مٹھی بھر انقلابیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے ہندوستان کی بڑی بڑی سلطنتوں کو ختم کر دیا تھا یہ امر واقعہ ہے کہ اگر ان بہادر انقلابیوں کی ذرا بھی ہمت افزائی کی جاتی تو انگریزی حکومت ہندوستان میں ۱۸۵۷ء ہی میں ختم ہو گئی ہوتی۔

انقلابیوں نے دہلی میں فاقے کئے۔ بھیک مانگی۔ اور ضرورت پڑتے پر عوام سے بالجبر بھی سامان خوراک وصول کیا۔ مگر ہر حالت میں وہ آزادی کی جنگ میں مصروف رہے۔

دہلی میں انگریزوں کا فاتحانہ داخلہ

انقلابی آخری وقت تک اسی امید میں رہے کہ شاید اب بھی ہندوستان کے مُردہ انسانوں میں زندگی پیدا ہو جائے۔ لیکن انگریزوں کو تو ابھی کچھ روز ہندوستان پر حکومت اور کرنی تھی۔ چنانچہ انگریزوں نے "وفا شعار" ہندوستانیوں کی مدد سے میرٹھ، کانپور، لکھنؤ اور وسطی ہند کے انقلابیوں کو دبالیا۔

اس انقلابی تحریک کو دبانے میں سب سے زیادہ انگریزوں کے معاون نظام، سکھ، اور راجہ نیپال تھا۔ چنانچہ اپنے ان وفا شعار دوستوں کے ذریعہ انگریزوں نے آزادی کی اس تحریک کو کچل دیا۔ جو اگر کامیاب ہو جاتی تو ہندوستان کی تاریخ موجودہ تاریخ سے بالکل مختلف نظر آتی۔ غرضکہ انگریز فوجیں جو پوری طاقت کے ساتھ ہر جگہ اس تحریکِ آزادی کو کچل رہی تھیں۔ دہلی میں بھی داخل ہو گئیں۔

ہندوستانیوں پر بے پناہ مظالم

۱۸۵۷ء کی اس جنگِ

آزادی کا انتقام لینے کے لئے انگریزوں نے ہندوستانیوں پر جو بے پناہ مظالم کئے ہیں وہ درندگی کا ایک ایسا شرمناک نمونہ ہے جس کی مثال شائد ہی دُنیا کی تاریخ میں مل سکے۔

انگریز ہندوستان کے جس شہر میں بھی داخل ہوئے انھوں نے اندھا دھند عوام کا قتل عام کیا۔ انگریزوں کی بربریت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جب نانا صاحب انگریزوں کے ہاتھ نہ آسکا۔ تو انگریزوں نے نانا صاحب کی لڑکی کو پکڑ کر زندہ جلا دیا۔

۱۸۵۷ء کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک انگریز لکھتا ہے کہ۔ "ہم نے ایک بڑے گاؤں میں آگ لگا دی۔ جب گاؤں کے باشندے آگ سے بچنے کے لئے بھاگے تو ہم نے انھیں گولیوں سے اُڑا دیا۔" غرضکہ گاؤں کے گاؤں تباہ کر دئے گئے۔

سر جان نے لکھا ہے کہ "انگریزوں نے انتقام کے جوش میں اندھے ہو کر عورتوں کو بخشا نہ بچّوں کو بلکہ بے گناہوں کا بھی اسی طرح قتلِ عام کیا گیا۔ جس طرح کہ اُن کو تہہِ تیغ کیا گیا جو اس بغاوت کے ذمّہ دار تھے۔ کالے ہندوستانیوں کو گولی سے اُڑاتے میں انتقام پسند انگریزوں کو ایک لُطف سا آتا تھا۔"

الٰہ آباد کے قریب ایک اسٹیمر بوٹ پر چڑھ کر انگریزوں نے دریا کے کنارے کے بے شمار گاؤں تباہ کر ڈالے۔ چنانچہ الٰہ آباد سے لیکر کانپور تک بڑی آزادی کے ساتھ ہندوستانی عورتوں اور بچّوں کا شکار کھیلا گیا۔

مسٹر رسل نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ "کبھی کبھی مسلمانوں کو مارنے سے پہلے انھیں سور کی کھال میں سی دیا جاتا تھا۔ اور اُن کے جسم پر سور کی چربی مل دیجاتی تھی اور پھر انھیں زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ اور اسی طرح ہندوؤں کو بھی مذہبی

دل آزاری کے بعد قتل کیا جاتا تھا۔

دہلی لکھنؤ۔ اور کانپور میں کس بے دردی کے ساتھ انگریزوں نے قتل عام برپا کیا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان شہروں میں بے گناہوں کی لاشوں کا جو انبار لگ گیا تھا۔ اُن کے اُٹھانے میں کئی مہینے صرف ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ انگریزوں نے جی کھول کر ہندوستانیوں سے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا انتقام لیا۔ نہ جوانوں کو چھوڑا، نہ بوڑھوں کو اور نہ عورتوں کو بخشا۔ نہ بچوں کو۔ جو بھی سامنے آیا۔ اُسے گولی کا نشانہ بنا دیا۔ صرف اس جرم میں کہ ہندوستانی انگریز کے پنجۂ استبداد سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

مغل بادشاہ کی گرفتاری

بہادرشاہ بادشاہ اور بعض شہزادے جو لال قلعہ چھوڑ کر ہمایوں کے مقبرہ میں چلے گئے تھے۔ اُن کو نہایت ذلت کے ساتھ گرفتار کیا گیا۔ جنرل ہڈسن نے بوڑھے بہادر شاہ کی آنکھوں کے سامنے اُس کے نوجوان بیٹوں کو گولی کا نشانہ بنایا۔ ہڈسن نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شہزادوں کا ایک چلو خون لے کر پیا۔ اور کہا کہ "اگر میں ایسا نہ کرتا تو میرا دماغ خراب ہو جاتا کیونکہ ان لوگوں نے میرے ہم قوموں کے قتل کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔"

انگریزوں کے ہاتھوں مغل بیگمات اور شہزادیوں کی بھی بری طرح توہین ہوئی۔ بہادر شاہ پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ اور مجرم قرار دے کر رنگون جلاوطن کر دیا گیا۔ چنانچہ اس آخری مغل بادشاہ کی موت عالمِ جلاوطنی ہی میں رنگون میں واقع ہو گئی۔

اس انقلابی ہنگامہ کے بعد

اس انقلابی ہنگامہ کے بعد انگریز

مطمئن تھے کہ ابھی تک ہندوستان میں ایسے "غدارانِ وطن" موجود ہیں جن کے ذریعے کافی عرصہ تک ہندوستانیوں کو غلام رکھا جا سکتا ہے۔ انگریز سب سے زیادہ نظام۔ سکھ اور راجہ نیپال کے ممنون تھے جنہوں نے انگریزوں کی سابقہ بدسلوکیوں کے باوجود "وفا شعاری" کے مسلک کو نہ چھوڑا۔ چنانچہ نظام برابر اس نازک وقت میں انگریزوں کو فوجی امداد بھیجتا رہا۔ سکھوں نے خلافِ توقع انگریز فوج میں شامل ہو کر انگریزوں کی بہت بڑی مدد کی تھی۔ اور نیپال بھی برابر فوجی امداد دیتا رہا تھا۔

یہ حقیقت ہے اور اس حقیقت سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس جنگِ آزادی میں دہلی اور یوپی کے علاوہ تقریباً ہندوستان کے ہر صوبہ نے مجرمانہ پہلو تہی کی تھی۔ اگر دوسرے صوبے بھی اس جنگِ آزادی میں دہلی اور یوپی کے ساتھ شامل ہو گئے ہوتے تو ہندوستان ۱۸۵۷ء ہی میں آزاد ہو چکا ہوتا۔ لیکن ہندوستان کی قسمت میں تو ابھی کچھ دن اور غلام رہنا تھا۔ چنانچہ وہ اس جنگِ آزادی کے بعد بھی غلام رہا اور زمانۂ دراز تک غلام رہا۔

چوتھا باب

انگریزی حکومت کا آخری دور

۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء

انگریزی حکومت کا آخری دور

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد سے ہندوستان میں انگریزی حکومت کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے جس کے بغور مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ انگریز نے سنگین کی نوک سے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کو دبا دیا تھا۔ لیکن یہ تحریک جتنی دبائی گئی۔ اُتنی ہی اُبھرتی چلی گئی۔ چنانچہ یہ باب ہندوستان میں انگریزی حکومت کی تاریخ کا آخری باب ہے۔

انگریزی حکومت کے آخری دور کی تاریخ جس میں کہ ہندوستان کی مختلف اقوام کی زندگیوں میں بڑی بڑی تبدیلیاں رُونما ہوئیں۔ یوں تو اپنی جگہ ایک مکمل اور باقاعدہ تاریخ ہے جس کے لئے ہزاروں صفحات درکار ہیں لیکن ہم طوالت سے بچنے کے لئے صرف اُنہی اہم واقعات کا ذکر کرینگے جن کا باشندگانِ ہند کی سیاسی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اس لئے اس باب کو ایک مسلسل تاریخ سمجھ کر نہیں بلکہ تاریخی تبصرہ سمجھتے ہوئے مطالعہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس تبصرہ میں تاریخی تسلسل سے اجتناب کرتے ہوئے جستہ جستہ صرف اُن واقعات کو بیان کیا جائے گا۔ جو اس عبوری دور میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

غدر کے بعد ملکہ وکٹوریہ کا اعلان

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اگرچہ ناکام ہوگئی تھی لیکن اس حادثہ نے لندن پارلیمنٹ میں ایک ہلچل برپا کر دی۔ چنانچہ لندن پارلیمنٹ کے ممبر یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ آئندہ ہندوستان میں کس ہنج پر حکومت کی جائے۔ اس مسئلہ پر بہت زیادہ غور وخوض کرنے کے بعد آخر یہ طے پایا کہ ہندوستان کو کمپنی کے زعما کے ہاتھوں

سے نکال کر کلی طور پر تاجِ برطانیہ کے حوالے کر دیا جائے۔ لہذا اس مقصد کے پیش نظر لندن پارلیمنٹ نے ۱۸۵۸ء میں ایک قانون پاس کر دیا جس کی رُو سے کمپنی کی حکومت ختم کر کے وزیرِ ہند کا عہدہ قائم کر دیا گیا۔ اور وزیرِ ہند کی مدد کے لئے ایک کونسل بنا دی گئی جس کا نام "انڈیا کونسل" رکھا گیا۔ ہندوستان کے گورنر جنرل کے خطاب میں "وائسرائے" یعنی نائب شاہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ اور اُس کا تقرر بادشاہ کی منظوری سے کیا جانے لگا۔

ملکہ وکٹوریہ کی جانب سے ماہ نومبر ۱۸۵۸ء میں اس جدید قانون کا اعلان ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستانیوں کو مطمئن کرنے کے لئے یہ بھی اعلان کیا کہ "آئندہ دیسی ریاستیں انگریزی علاقہ میں شامل نہیں کی جائیں گی۔ والیانِ ریاست کو متبنیٰ بنانے کا حق ہوگا۔ انگریزی حکومت اُن تمام عہد ناموں کی سختی سے پابندی کرے گی جو کمپنی اور والیانِ ملک کے درمیان ہو چکے ہیں۔ ہندوستانی رعایا کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی اور عہدوں کی تقسیم میں رنگ، مذہب اور نسل کا قطعاً لحاظ نہیں کیا جائے گا۔" نیز یہ بھی اعلان کیا گیا کہ انگریزی حکومت غدر ۱۸۵۷ء کے باغیوں سے چونکہ کوئی انتقام لینا نہیں چاہتی۔ اس لئے اُن تمام باغیوں کو معاف کر دیا جائے گا جنہوں نے انگریزوں کے قتل میں حصہ نہیں لیا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانیوں کو اس اعلان کے ذریعہ یہ بھی یقین دلایا گیا کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کی سیاسی مالی تجارتی اور صنعتی ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گی۔ غرضکہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے ہندوستان میں حکومت کا ایک نیا ڈھانچہ بنا کر کھڑا کر دیا۔ جس کو کامیاب بنانے کی غرض سے ملکہ نے اپنے اعلانِ معافی کے ذریعہ ہندوستانیوں کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی ہر امکانی کوشش کی۔

وائسرایوں کا دورِ حکومت

پارلیمنٹ کے جدید قانون اور ملکہ کے اعلان کے فوراً ہی بعد ۱۸۵۸ء سے ہندوستان میں وائسرایوں کی حکومت کا وہ دور شروع ہو گیا۔ جو ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خاتمہ تک باقی رہا چنانچہ غدر کے زمانہ کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ کو ہندوستان کا سب سے پہلا وائسرائے مقرر کیا گیا۔

قبل اس کے کہ ہم سیاسی واقعات پر تبصرہ کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس تبصرہ کے شروع ہی میں ہندوستان کے تمام وائسرایوں کے نام اور زمانہ حکومت درج کر دیا جائے۔ تاکہ آگے چل کر جو واقعات پیش آنے والے ہیں اُن کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ ہندوستان میں ملکہ وکٹوریہ کے اعلان سے لے کر انگریزی حکومت کے خاتمے تک جو انیس وائسرائے ہوئے ہیں اُن کے نام یہ ہیں۔

(۱) لارڈ کیننگ .... ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۲ء تک

(۲) لارڈ ایلگن .... ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۴ء تک

(۳) سر جان لارنس .... ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۹ء تک

(۴) لارڈ میو .... ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۲ء تک

(۵) لارڈ نارتھ بروک .... ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۶ء تک

(۶) لارڈ لٹن .... ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۰ء تک

(۷) لارڈ رپن .... ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء تک

(۸) لارڈ ڈفرن .... ۱۸۸۴ء سے ۱۸۸۸ء تک

(۹) مارکوئس آف لینسڈون .... ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۴ء تک

(۱۰) لارڈ کرزن .... ۱۸۹۴ء سے ۱۹۰۵ء تک

(۱۱) لارڈ منٹو .... ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک

(۱۲) لارڈ ہارڈنگ .... ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۶ء تک

(۱۳) لارڈ چمسفورڈ .... ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۱ء تک

(۱۴) لارڈ ریڈنگ .... ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۶ء تک

(۱۵) لارڈ ارون .... ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۱ء تک

(۱۶) لارڈ ولنگڈن .... ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک

(۱۷) لارڈ لنلتھگو .... ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۴ء تک

(۱۸) لارڈ ویول .... ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۶ء تک

(۱۹) لارڈ ماؤنٹ بیٹن .... ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء تک

ان اُنیس وائسرایوں نے اس برِ صغیر پر تقریباً نوّے سال حکومت کی ان کے دورِ حکومت میں اس ملک میں جو اہم واقعات رُونما ہوئے اب ہم اُن پر روشنی ڈالیں گے۔

انگریزی تیغ ستم کے شکار

ملکۂ وکٹوریہ کے عام معافی کے اعلان کے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ "معافی" کے مُعاملہ میں ہندوستان کی جملہ اقوام کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا لیکن معافی کے اس اعلان کے فوراً ہی بعد انگریز کے طرزِ عمل نے یہ بتا دیا کہ ہندوستان کی دوسری تمام اقوام کو تو معاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس مسلمان کو کسی طرح بھی معافی نہیں دیجاسکتی جس سے کہ حکومت چھینی گئی ہے۔ اور جس کا فنا کر دینا اور کچل دینا انگریزی سیاست کا اہم ترین جزو ہے۔ چنانچہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ذبح کیا گیا۔ اس قوم کے نونہالوں کو سربازار گولیوں سے اُڑایا گیا۔ ان کو پھانسیوں پر لٹکایا گیا۔ ان کے گھروں کو لُوٹا گیا۔ اس قوم کو مفلس اور قلاش بنانے کے لئے مسلمانوں کی جاگیروں اور جائدادوں کو ضبط کر لیا گیا۔ اور

وہ سب کچھ کیا گیا جو ایک ظالم اور حاکم قوم مجبور اور محکوم قوم کے ساتھ کرتی ہے۔
ایک طرف تو مسلمانوں کو کچلا جا رہا تھا اور دوسری طرف ہندوستان کی دیگر اقوام اور مذاہب کے لوگوں کی دلداری کی جا رہی تھی۔ اس لیئے نہیں کہ انگریزوں کو مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کی دیگر اقوام سے کوئی عشق یا محبت تھی بلکہ اس لیئے چونکہ دیگر اقوام حکمران قومیں نہیں تھیں اور اُن سے انگریزوں کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ انگریز دوسری قوموں کے بل پر ہی مسلمانوں کے کچلنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ تاکہ اس طرح مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ اور ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں میں تفریق پیدا ہونے کے بعد فرقہ پرستی کی ایک نئی آگ بھڑک اُٹھے۔ چنانچہ ۱۸۶۱ء میں جب انڈین کونسلز ایکٹ پاس ہوا۔ اور یہ طے ہوا کہ گورنر جنرل کی مجلس قانون ساز میں ممبروں کی تعداد بڑھا کر آدھے ممبر غیر سرکاری لیئے جائیں تو غیر سرکاری ممبروں کی نامزدگی کے وقت مسلمانوں کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا گیا۔ بھلا اُس قوم کے افراد کی ہمت افزائی انگریز وائسرائے کیونکر کر سکتا تھا جو ایک سرے ہی سے ازلی باغی قرار دیدی گئی تھی۔

اس سلسلہ میں یہ بھی بتا دینا نہایت ضروری ہے کہ جہاں انگریز نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کو کچلا۔ وہاں غیر مسلموں کے اُن خاندانوں کو بھی پیس کر رکھ دیا تھا۔ جو کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کے دوش بدوش لڑے تھے۔ انگریز کا تخیل یہ تھا کہ یہ سارا فتنہ صرف مسلمانوں کا پیدا کردہ ہے اور مسلمانوں ہی نے غیر مسلموں کو بھی ورغلایا تھا۔ لیکن جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے سارا ہی ہندوستان بلا امتیاز مذہب وملت انگریز سے متنفر ہو چکا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسلمانوں نے اس جنگِ آزادی میں دوسری اقوام کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ غرضکہ انگریز چونکہ اس فتنہ کا بانی مبانی مسلمانوں کو سمجھ رہا

تھا۔ اس لئے اُس نے دیگر اقوام کو نظر انداز کرنے کے بعد اپنی زیادہ تر نظرِ عنایت" مسلمانوں ہی پر مرکوز رکھی۔

وہابی مسلمانوں کا جہاد

انگریز نے غدر کے بعد سے ہندوستان کے مسلمانوں کو جس بے دردی کے ساتھ کچلا تھا اُس نے مسلمانوں کے دلوں کو بُری طرح مجروح کر دیا تھا۔ اور مسلمانوں میں اندر ہی اندر جوشِ انتقام بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن ایسی حالت میں جبکہ مسلمانوں کے سینوں پر سنگینیں رکھی ہوئی ہوں مسلمان کر بھی کیا سکتے تھے۔

مسلمان اپنی تمام مجبوریوں اور کمزوریوں کے باوجود بھی اِس ظلم اور زیادتی کو زیادہ مدّت تک برداشت نہ کر سکے۔ چنانچہ ہندوستان میں مجاہدینِ اسلام کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جنہوں نے یہ طے کر لیا کہ خواہ نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ انگریز کے خلاف جہاد کریں گے۔ یہ جماعت اندر ہی اندر زور پکڑتی رہی۔ آخر اس جماعت کے لیڈروں نے یہ طے کیا کہ شمال ومغربی سرحد جہاں سے آزاد قبائل کی امداد بھی مل سکتی ہے۔ اُسے انگریز کے خلاف جنگی سرگرمیوں کا مرکز بنایا جائے۔

۱۸۶۲ء میں اچانک جب شمال ومغربی سرحد کی جانب سے نعرۂ جہاد بلند ہوا اور ہزاروں مسلمان انگریزوں کے خلاف مجاہدین کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تو انگریز کو پتہ چلا کہ یہ اُس کے ظلم اور زیادتیوں کا ردِّ عمل ہے۔ لارڈ ایلگن وائسرائے ہند کی فوجیں فوراً حرکت میں آ گئیں۔ لیکن انگریز فوجوں کو تقریباً ہر مورچہ پر ان مذہبی دیوانوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔

انگریز کی تلوار جہاں ناکام ثابت ہوتی ہے وہاں وہ اپنے عیّاری کے اُس پُرانے حربہ کو کام میں لاتا ہے جو ہمیشہ بے خطا ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ فوراً ہی سازش کا جال بچھا دیا گیا۔ پٹھان سرداروں کو سازش میں شریک کر لیا گیا۔ بس پھر کیا تھا

وہابیوں کے لشکر میں پھوٹ پڑ گئی۔ اب انگریز کے لئے ان پر قابو پا لینا دشوار نہ تھا۔ ان کے مرکزی قلعہ کو آگ لگا دی گئی۔ وہابی بُری طرح مارے گئے۔ جو بچ گئے وہ منتشر ہو گئے اور انگریزوں کو اُس خطرہ سے نجات مل گئی۔ جو ۱۸۵۷ء کے سانحہ سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔

بھوٹان کی جنگِ آزادی

سرحدی علاقہ کی جانب سے وہابیوں نے جو نعرۂ جہاد بلند کیا تھا۔ اُس کو انگریز نے اگرچہ مکر اور عیّاری کے ساتھ دبا دیا تھا۔ لیکن اس نعرے کی صدائے بازگشت ۱۸۶۴ء میں جب بھوٹان کی پہاڑیوں سے بلند ہوئی تو انگریز یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اگرچہ بھوٹانیوں کو مذہب اور نسل کے اعتبار سے وہابی مسلمانوں سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ لیکن انھوں نے وہابیوں کی تقلید کرتے ہوئے علم بغاوت کیوں بلند کر دیا۔

انگریز کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی پچھلی کوتاہیوں کو بہت جلد بھلا دیتا ہے اُسے اس وقت یہ یاد نہیں رہا کہ ابھی چند سال ہوئے جن نیپالیوں کو اُس نے طاقت سے نہیں بلکہ عیّاری سے کچلا تھا۔ بھوٹانی اُن ہی کے بھائی ہیں۔ اور وہابیوں کے جہاد نے پھر ایک بار اُنھیں بھولا ہوا افسانہ یاد دلا کر میدان میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔

مسلمان ہوں، نیپالی ہوں یا بھوٹانی۔ بنیادی سبب ایک ہی تھا یعنی انگریز کے آہنی پنجے سے نجات حاصل کی جائے۔ چنانچہ محب وطن بھوٹانیوں نے انگریزی علاقوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ جب انگریزوں نے بھوٹانیوں سے تنگ آ کر صلح صفائی کے لئے ایلچی بھیجا تو اُنھوں نے اس کا خوب مذاق اُڑایا اور اُس کی بُری طرح سے گت بنائی۔ غرضکہ وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ سکا۔

وائسرائے ہند سر جان لارنس سفید فام ایلچی کی اس توہین کو کیونکر گوارا کر سکتا تھا۔ فوراً بھوٹان پر چڑھائی کر دی گئی۔ تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ آزادی کی جنگ اچانک کیسے بند ہو گئی۔ غالباً اس میں بھی انگریز کی "کیٹی گھری سیاست" کی کارفرمائی تھی۔ بہر حال وہابیوں کے جہاد کے بعد انگریز کو بھوٹان کی جنگِ آزادی سے بھی نجات مل گئی۔ اور انگریز اس بہادر پہاڑی قوم کی جانب سے بھی مطمئن ہو گیا۔

مسلمانوں کے لئے سرکاری دروازے بند

مسلمان جس نے پہلے تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا اور اُس کے بعد ۱۸۶۱ء میں جہاد کا نعرہ بلند کر کے انگریزوں کے مقابلہ پر آ گیا تھا۔ اب اسکے باغی ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا تھا۔ لہذا ہندوستان کی سرزمین پر اُس کا وجود انگریز کے لئے ایک مستقل خطرہ بن گیا۔ انگریز سب کچھ برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن وہ کسی ایسی قوم کو کبھی نہیں گوارا کر سکتا جسمیں حب الوطنی کے شریفانہ جذبات موجود ہوں۔ چنانچہ حب الوطنی کے جرم میں مسلمانوں کو ہر پہلو سے تباہ اور برباد کرنے کے لئے ایک مستقل پروگرام تیار کر لیا گیا۔

کسی زندہ قوم کو مٹانے کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اُس پر ہر پہلو سے اقتصادی ضربیں لگانے کے بعد اُسے مُردہ بنا دیا جائے تاکہ مالی مشکلات اور تنگدستیوں میں مبتلا ہونے کی بنا پر وہ خود ہی اپنی اخلاقی خصوصیات سے محروم ہو جائے۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مسلمانوں کی جاگیروں اور جائدادوں کی ضبطی کا سلسلہ تو غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا لیکن اسکے بعد یہ کوشش کی گئی کہ سرکاری ملازمتوں کے دروازے بھی مسلمانوں کے لئے بند کر دئے جائیں۔ چنانچہ مسلمان "باغیوں" کو سرکاری

ملازمت میں لینا ممنوع قرار دیدیا گیا۔

انگریز اعلیٰ درجہ کا سیاست داں ہونے کے ساتھ بہت بڑا دُوراندیش بھی ہے۔ جاگیروں اور جائدادوں کی ضبطی اور سرکاری دفاتر کے دروازے بند کرنے کے بعد اُسے فکر ہوئی کہ اگر مسلمانوں نے اعلیٰ اور جدید تعلیم حاصل کرنی شروع کردی اور اُن کے دماغ علوم وفنون کی روشنی سے منور ہوگئے تو یہ قوم آگے چل کر انگریز کیلئے پھر ایک زبردست خطرہ بن سکتی ہے۔ چنانچہ سرکاری دفاتر کے دروازوں کی طرح اسکول اور کالجوں کے دروازے بھی مسلمانوں کے لئے بند کردئے گئے محض اس جرم میں کہ وہ وطن کی آزادی کے معاملہ میں دیگر اقوام کے مقابلہ میں پیش پیش رہے تھے۔ اور اُن کو بدقسمتی سے ہندوستان کی سابق حکمراں قوم سمجھا جاتا تھا۔

مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت

انگریز کی پے درپے ضربوں نے اُس مسلمان کی حالت کو بد سے بدتر بنادیا۔ جو پہلے ہی زوال کی طرف تیزی کے ساتھ چلا جارہا تھا۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں مسلمان قوم کا زوال ۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہوا۔ بلکہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا زوال تو مسلمانوں کے زوال کی وہ انتہا تھی جس سے کہ مسلمان قوم بُری طرح موت وحیات کی کشاکش میں مبتلا ہوگئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان قوم کا زوال حکومتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا۔ مسلمان قوم میں اگر غدر سے بہت پہلے قومی اضمحلال نہ پیدا ہوگیا ہوتا تو انگریز کی کیا مجال تھی کہ وہ ہندوستان میں قدم جما سکتا۔ نواب کرناٹک کی انگریز نوازی۔ نظام کی وطن دشمنی۔ میر جعفر کی غداری۔ نواب اودھ کی قوم فروشی اور خود مغل بادشاہ شاہ عالم کی بے حسی کیا مسلمان قوم کے زوال کی

کھلی ہوئی نشانیاں نہیں تھیں۔ چنانچہ اس زوال پذیر مسلمان قوم کو جب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز نے پے در پے ضربیں لگائیں تو مسلمانوں کی قومی زندگی خطرہ میں پڑ گئی۔

حکومت جا چکی تھی۔ مسلمانوں کی بیشتر جاگیریں اور جائدادیں ضبط ہو چکی تھیں۔ جو باقی رہ گئی تھیں وہ کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے اور شاہانہ اخراجات کی بنا پر سود در سود کی برکت سے مہاجنوں کی طرف منتقل ہو رہی تھیں۔ صنعت و تجارت سے اُن کو واسطہ نہ تھا۔ اب رہ گئیں سرکاری ملازمتیں اوّل تو انگریز سے فطری نفرت رکھنے کی بنا پر مسلمان خود ہی انگریز کی ملازمت سے کتراتے تھے۔ دوسرے انگریز نے بھی مسلمانوں کو غدار ازلی قرار دیتے ہوئے سرکاری دفاتر کے دروازے اُن کے لئے بند کر دئے تھے۔ غرضکہ معاش کی راہیں۔ ہر چہار طرف سے مسلمانوں کے لئے بند ہو گئی تھیں اور مسلمان ایسی نازک حالت میں مبتلا تھے کہ اندیشہ تھا کہ کہیں یہ قوم ہندوستان میں اسپین کی طرح بالکل نہ مٹ جائے۔

مسلمان قوم کا پہلا ہمدرد

مسلمان قوم کی اس تباہی اور بربادی کو دیکھ کر جس مردِ مومن کے دل میں سب سے پہلے مسلمان قوم کے لئے درد پیدا ہوا، وہ سر سید تھا۔ اس نے فوراً محسوس کر لیا کہ اگر اس گرتی ہوئی قوم کو نہ سنبھالا گیا تو چند سال کے اندر اندر ہندوستان کی وہ مقتدر قوم بالکل فنا ہو جائے گی جس نے مسلسل گیارہ سو برس تک ہندوستان پر فرمانروائی کی ہے۔

اس خیال کے آتے ہی سر سید نے قوم کی احیا اور بقا کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ اُس نے مسلمانوں کو جدید علوم و فنون کی دعوت دی۔ اُس نے

مسلمانوں کو بتایا کہ اب تم حکمراں قوم نہیں ہو۔ بلکہ ایک محکوم قوم ہو جس کو کہ حالات کے مطابق اپنے آپ کو سانچے میں ڈھالنا ہے۔ انگریز کے خلاف تمہاری زبانی نفرت اُس وقت تک قطعی بے معنی ہے۔ جب تک کہ تمہارے اندر خود انگریز کے مقابلہ کی اہلیت اور طاقت نہ پیدا ہو جائے۔

سر سید کی اِن کوششوں کا جواب مسلمان قوم نے سر سید کو یہ دیا کہ سر سید پر کفر کے فتوے لگائے گئے۔ سر سید پر کرسٹان ہونے کی پھبتی کسی گئی۔ اور سر سید کے راستہ میں قدم قدم پر رُکاوٹیں پیدا کی گئیں۔

سر سید کا عملی قدم

سر سید سمجھتا تھا کہ جس قوم پر انحطاطی کیفیت طاری ہو اُس سے اِس کے سوا اور کیا اُمید ہو سکتی ہے لیکن یہ مردِ مومن اپنی قوم کی طعنہ زنی کے باوجود چین سے نہ بیٹھا۔ یہ ہندوستان کے ایک ایک مقتدر انگریز سے ملا۔ اور اس کے بعد لندن گیا۔ اور اُس نے انگریزوں کے دل سے اِس خیال کو بڑی حد تک نکال دیا کہ مسلمان ایک باغی قوم ہے۔ غرضکہ سر سید نے بڑی جدوجہد کے بعد مسلمانوں کے لئے حالات کو سازگار بنا دیا۔

۱۸۷۵ء میں سر سید نے علی گڈھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کر دیا تاکہ وہ مسلمان جو انگریزی تعلیم سے بھاگتے ہیں۔ اور جو سرکاری مدارس میں اپنے بچوں کو اس اندیشہ سے نہیں بھیجتے کہ کہیں اُن کو کرسٹان نہ بنا لیا جائے۔ انھیں مسلمانوں کے قائم کردہ کالج میں اپنے بچوں کو بھیجنے میں کوئی اعتراض نہ ہو۔ غرضکہ سر سید نے اپنی کوششوں سے مسلمانوں کو جدید تعلیم کے حصول کے لئے آمادہ کر لیا۔ سر سید کا مقصد پورا ہو گیا اور علی گڈھ کالج میں نئی رونق دکھائی دینے لگی۔ چنانچہ ۱۸۷۵ء کے بعد مسلمانوں کی جتنی بھی سیاسی تحریکیں ملک میں پھیلیں۔ اُن کے

پھیلانے میں یا تو سرسید کے ساتھیوں کا ہاتھ تھا۔ یا اُس کے محرک وہ لائق حضرات تھے جنہوں نے سرسید کے کالج سے فیض حاصل کیا تھا۔ گویا علی گڑھ کالج رفتہ رفتہ ہندوستان میں مسلم سیاسیات کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔

انگریز کی مزید عنایتیں

سرسید جس زمانہ میں مسلمان قوم میں حیاتِ نَو پیدا کرنے کے لئے جدوجہد میں مصروف تھا۔ اُسی زمانہ میں اس برِ صغیر کے ہندوؤں میں غیر معمولی بیداری پیدا ہوچکی تھی اور انگریز برِ صغیر کے باشندوں میں زندگی کی اس لہر کو بڑی تشویش کی نظر سے دیکھ رہا تھا چنانچہ انگریز برابر ہندوستان کی گرفت کو مضبوط کرتا چلا جا رہا تھا۔

گورہ فوج یوں تو لارڈ کیننگ ہی کے زمانہ میں کافی سے زیادہ بڑھ چکی تھی لیکن بعد کے وائسرایوں نے گورہ فوج کے تسلط کو اس قدر بڑھا دیا تھا۔ کہ اُس کے ذریعہ ہندوستان کی آزادی کی ہر تحریک کو آسانی سے کچلا جا سکتا تھا۔ انکم ٹیکس کی لعنت ملک پر نازل ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ نمک ٹیکس لگا کر ہندوستان کے غریبوں کا خون چُوسنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا تھا۔

انگریز کو سب سے زیادہ فکر یہ تھی کہ دیسی زبان کے اخبارات نکلنے شروع ہو گئے ہیں اور ان اخباروں سے یہ اندیشہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ کہیں یہ ہندوستان میں بیداری کی نئی لہر نہ پیدا کر دیں۔ لہٰذا دیسی زبان کے اخبارات کو کچلنے کے لئے ۱۸۷۸ء میں "ورنکولر پریس ایکٹ" پاس کیا گیا جس کی رُو سے دیسی زبان کے اخبارات سے ضمانتیں طلب کی گئیں۔ اور اُن کا گلا گھونٹ دیا گیا لیکن انگریزی زبان کے اخبارات اس سخت قانون سے مستثنےٰ رہے۔

افغانستان کی دوسری جنگ

ہندوستان کی حفاظت کی خاطر انگریزوں کو ہندوستان کے

پڑوسی اسلامی ملک افغانستان کی بڑی فکر تھی - انگریز کو اندیشہ تھا کہ کوئی نیا غزنوی غوری یا ابدالی - ہندوستان کے مسلمانوں کی حمایت کے لئے کھڑا ہو کر ہندوستان کی نوزائیدہ انگریزی حکومت کو مشکلات میں نہ مبتلا کر دے - چنانچہ انگریز نے "روسی خطرہ" کا نعرہ بلند کر کے بلاوجہ ۱۸۷۹ء میں کئی مورچوں سے افغانستان پر چڑھائی کر دی۔

انگریزوں کو فتح حاصل ہو گئی، افغانستان کا بادشاہ امیر شیر علی فرار ہو کر روسی علاقہ میں چلا گیا۔ اور وہیں مر گیا۔ انگریزوں نے امیر شیر علی کے بیٹے یعقوب خاں سے من مانی شرائط پر صلح کر کے اُسے افغانستان کے تخت پر بٹھا دیا۔ افغانستان میں انگریز ریزیڈنٹ رہنے لگا۔ تمام اہم علاقوں پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا خارجی پالیسی انگریزوں نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ گویا انگریز نے ہندوستان کی خاطر افغانستان کو بھی غلام بنا لیا۔

وائسرائے ہند لارڈ لٹن خوش تھا کہ اُس نے پہلی جنگ افغانستان کی ناکامی کا بھی انتقام لے لیا اور برطانوی حکومت میں ایک نئے ملک کا اضافہ بھی کر دیا۔ لیکن اُس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی کیونکہ خوددار افغانیوں نے اچانک سخت بغاوت کر دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لارڈ لٹن کی بجائے ۱۸۸۰ء میں لارڈ رپن ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہو چکا تھا۔

بغاوت جب زیادہ بڑھی تو انگریز کا بنایا ہوا شاہ افغانستان یعقوب خاں فرار ہو کر انگریزوں کے پاس ہندوستان چلا آیا۔ یعقوب خاں کے بھائی ایوب خاں نے افغانستان میں ایسا سخت ہنگامہ برپا کیا۔ کہ انگریز گھبرا گئے۔ انگریزوں نے ایوب خاں کو شکست تو دیدی۔ اور اُسے گرفتار بھی کر لیا لیکن اس کے ساتھ ہی انگریزوں کو یہ بھی محسوس ہو گیا کہ افغانستان جیسی سنگلاخ زمین میں تسلط قائم

حکومت کا پودا کسی طرح بھی پھل پھول نہیں سکتا۔ چنانچہ افغانستان کی بغاوتوں سے تنگ آ کر وائسرائے ہند نے افغانستان کی حکومت یعقوب خاں کے بھتیجے امیر عبدالرحمٰن کے سپرد کر دی۔ امیر عبدالرحمٰن نے برابری کے اُصول پر انگریزوں سے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے۔ آپ نے دیکھا کہ انگریزوں کو صرف ہندوستان کو غلام رکھنے کی خاطر کیسی کیسی دُشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

نیشنل کانگریس کا قیام

ایک طرف انگریز ہندوستان میں اپنے قدم مضبوط کرنے کے لئے جوڑ توڑ میں لگا ہوا تھا۔ دوسری جانب ہندوستان کے باشندے بھی غافل نہ تھے۔ خصوصیت کے ساتھ غیر مسلم باشندوں میں کافی بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُنھوں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے آپ کو جدید حالات کے سانچے میں ڈھال لیا تھا اور جدید علوم کے حصول میں بڑی سرگرمی کے ساتھ حصّہ لیا تھا۔ اور ان کے لئے سہولتیں بھی تھیں۔ کیونکہ انگریز ان سے بدظن نہ تھا۔ بلکہ سیاسی اغراض کی خاطر ان پر وہ کسی نہ کسی حد تک مہربان تھا۔

تعلیم اور بیداری نے غیر مسلموں میں کافی سیاسی رُجحان پیدا کر دیا تھا۔ ان کی متعدد سیاسی انجمنیں بنگال۔ مہاراشٹر اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم ہو چکی تھیں۔ لیکن ان انجمنوں کا چونکہ کوئی مشترکہ پروگرام نہ تھا اس لئے ۱۸۸۵ء میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان میں ایک ایسی وسیع انجمن کی بنیاد ڈالی جائے جس میں تمام چھوٹی چھوٹی سیاسی انجمنوں کو مدغم کر کے ایک پلیٹ فارم پر لایا جا سکے۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء میں چند تعلیم یافتہ انگریزوں اور ہندوستانیوں نے مل کر انڈین نیشنل کانگریس کی بُنیاد رکھ دی۔

انڈین نیشنل کانگریس کا اصل بانی ایک ریٹائرڈ انگریز افسر مسٹر اے او ہیوم

تھا۔ کانگریس کے قیام کے بعد تمام چھوٹی چھوٹی سیاسی انجمنوں کو اس میں مدغم کر دیا گیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی ابتدا میں حالت یہ تھی کہ اس کے جلسوں میں یونین جیک لہرایا جاتا تھا اور اس کے ریزولیشنوں کے ذریعہ انگریزوں کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا جاتا تھا اور یہی واقعات اور حالات کا تقاضہ بھی تھا۔ اس وقت کسی کو یہ تصور بھی نہیں تھا کہ یہی انڈین نیشنل کانگریس ایک روز ہندوستان کی حکمراں طاقت بن جائے گی۔

سرسید کانگریس میں شرکت کے مخالف

کانگریس کے قیام کے بعد سرسید اس بات کے شدید مخالف تھے کہ مسلمان کانگریس میں شریک ہوں۔ سرسید کی یہ مخالفت اس بنا پر نہیں تھی کہ سرسید کو کانگریس سے کسی قسم کا بغض و عناد تھا۔ بلکہ اس کے دو سبب تھے۔ پہلا سبب تو یہ تھا کہ سرسید اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں مسلمانوں کے سیاسیات میں شامل ہونے کے بعد انگریز دوبارہ مسلمانوں سے بدظن نہ ہو جائیں اور ان کو پھر باغی نہ قرار دیدیں۔ نیز مسلمانوں کے شامل ہونے کے بعد کہیں کانگریس کو سرے ہی سے باغی انجمن نہ قرار دیدیا جائے۔ اس کے علاوہ دوسرا سبب یہ تھا کہ کانگریس نے جس نوعیت کی حکومت کا مطالبہ شروع کیا تھا۔ سرسید اس قسم کی حکومت کے مخالف تھے۔ اُن کی رائے تھی کہ مسلمان اقلیت میں ہونے کی وجہ سے کانگریس کے مجوزہ نظام حکومت سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکینگے۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ اس قسم کی جمہوری حکومت مسلمانوں کی قومی خصوصیات کو برباد کر ڈالے۔ غرضکہ سرسید نے مسلمانوں کو کانگریس سے علحدہ رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی لیکن پھر بھی مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد کانگریس میں شامل ہو گئی تھی۔

برما کی تیسری لڑائی

عین اسی زمانہ میں جب کہ ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگریس کی بُنیاد رکھی جا رہی تھی۔ انگریز فوجیں ۱۸۸۵ء میں سمندر اور خشکی کے راستوں سے برما کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

برما کا گناہ یہ تھا کہ برما کا محب وطن راجہ "تھی باؤ" انگریزوں کی ابن الوقتیوں سے تنگ آنے کے بعد فرانسیسیوں سے تعلقات بڑھا رہا تھا۔ انگریزوں کے لئے اوّل تو یہی خیال کافی تکلیف دہ تھا کہ ابھی تک برما میں ایک برمی راجہ کا اقتدار باقی ہے۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ اس راجہ نے سلطان ٹیپو کی سنّت پر عمل کرتے ہوئے جب فرانسیسیوں سے ربط ضبط پیدا کیا تو انگریز کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔

برما کے راجہ نے چونکہ ایک انگریز کمپنی پر تین لاکھ جرمانہ کر دیا تھا۔ اس لئے انگریزوں کو "انگریز قوم کے ساتھ ناروا سلوک" کا بہانہ بھی مل گیا۔ یہ بہانہ فوج کشی کے لئے بالکل کافی تھا۔ چنانچہ اس زمانہ کے وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن نے برما پر چڑھائی کر کے مانڈلے اور تمام شمالی برما پر قبضہ جما لیا۔ برما کے راجہ کو قیدی بنا کر ہندوستان لایا گیا۔ اور جنوری ۱۸۸۶ء میں شمالی برما بھی انگریزی سلطنت میں شامل ہو گیا۔

مسلمانوں کی پہلی انجمن

انگریز تو جدید فتوحات اور فوجی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ اور ہندوستان میں رفتہ رفتہ سیاسی بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ کانگریس نے ۱۸۸۵ء میں قائم ہونے کے بعد اپنا سیاسی پروگرام شروع کر دیا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی بہت قلیل تعداد کانگریس میں شامل ہوئی تھی۔ ہم بتا چکے ہیں کہ مسلمان کانگریس سے محض اس لئے الگ تھے۔ کیونکہ سرسید کو اندیشہ تھا کہ مسلمانوں کے کانگریس میں شامل ہونے کے بعد دوبارہ

باغی نہ قرار دیدیا جائے لیکن اس کے باوجود بھی سرسید اور اُن کے تمام ساتھی مسلمانوں کے لئے سیاسی انجمن کی سخت ضرورت محسوس کر رہے تھے۔

سرسید اور اُن کے ساتھیوں کے لئے سب سے بڑی دقّت یہ تھی کہ اگر وہ کسی سیاسی انجمن کی بُنیاد رکھتے تھے تو مسلمانوں کے لئے دوبارہ باغی قرار دیدئے جانے کا پورا اندیشہ تھا۔ اور اگر سیاسی انجمن کے قیام میں پہلو تہی کرتے تھے تو مسلمان سیاسی جدوجہد میں پیچھے رہے جا رہے تھے۔

آخر سرسید نے یہ ترکیب نکالی کہ ایک ایسی انجمن قائم کی جائے جو بظاہر تو غیر سیاسی ہو لیکن اُس سے سیاسی پلیٹ فارم کا بھی کام لیا جاسکے۔ چنانچہ سرسید اور اُن کے ساتھیوں نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک تعلیمی انجمن کی بُنیاد رکھ دی تاکہ اس تعلیمی انجمن سے انگریز بھی نہ بدکیں اور مسلمان اس کے ذریعہ تعلیمی اور سیاسی دونوں مقاصد کے لئے جدوجہد کرسکیں۔ علی گڑھ کالج کے قیام کے بعد سرسید احمد خاں اور مسلمان لیڈروں کا ہندوستان کی سیاست میں یہ دوسرا اہم قدم تھا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی کامیابی

سرسید اور اُن کے ساتھیوں نے ہندوستان کے کونے کونے میں دورے کرکے ایجوکیشنل کانفرنس کو خوب کامیاب بنایا۔ چنانچہ یہ انجمن سالہا سال تک مسلمانوں کے متحدہ سیاسی پلیٹ فارم کا کام دیتی رہی۔ مسلمانوں کے تمام تعلیمی سیاسی اور معاشرتی مسائل اس کانفرنس کے ذریعہ طے ہوئے تھے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اس کانفرنس نے مسلمانان ہند میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں بہت بڑا حصّہ لیا ہے۔ حیدرآباد کے وزیر خارجہ نواب محسن الملک جب ملازمت سے سبکدوش ہوگئے تو انھوں نے اس کانفرنس کو خوب ترقی دی۔ غرضکہ علیگڈھ کالج اور اس کانفرنس نے سرسید کی انتھک

کوششوں کی بدولت مسلمانانِ ہند کو پستی سے نکالکر اُنمیں نئی رُوح اور زندگی پیدا کر دی تھی۔

کونسلوں کا کھلونا

ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں جو سیاسی بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ انگریز ہندوستان میں بیٹھا ہوا اس کا بغور مطالعہ کر رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ اگر ہندوستانیوں کو مطمئن نہ کیا گیا تو کوئی تعجب نہیں کہ ہندوستان میں دوسرا غدر ۱۸۵۷ء پھر پیدا ہو جائے۔

اس مقصد کے پیش نظر وائسرائے ہند لارڈ لینسڈون کے عہد حکومت میں یعنی ۱۸۹۲ء میں انڈین کونسلز ایکٹ کا نیا کھلونا لندن پارلیمنٹ نے ہندوستانیوں کے دل بہلانے کے لئے تیار کر دیا۔

اس ایکٹ کی رُو سے کونسلوں میں توسیع کی گئی۔ مرکزی اور صوبجاتی مجالس قانون ساز میں غیر سرکاری ممبروں کی تعداد بڑھا دی گئی لیکن پھر بھی سرکاری ممبروں کی تعداد غیر سرکاری ممبروں سے زیادہ ہی رہی تاکہ سرکار بہادر حسب معمول من مانی کارروائی کرتی رہے۔

اس ایکٹ سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس سے قبل تو کونسل کے غیر سرکاری ممبروں کی نامزدگی سو فی صدی سرکاری آدمی کرتے تھے۔ لیکن اب یونیورسٹیوں ڈسٹرکٹ بورڈوں۔ میونسپل کمیٹیوں۔ چیمبر آف کامرس کے ممبروں اور زمینداروں کو کونسلوں کے لئے ممبر منتخب کرنے کا حق دیدیا گیا یعنی ہندوستانیوں کو کسی نہ کسی حد تک ملکی معاملات میں حصہ لینے کا موقع دیا جانے لگا۔

ہندو مسلم فسادات کی ابتدا

۱۸۹۳ء ہندوستان کی تاریخ کا وہ منحوس سال ہے جس میں کہ ہندوستان کے بدنصیب باشندوں کو پہلی مرتبہ ہندو مسلم فسادات کی تباہ کاریوں سے واسطہ پڑا۔ انگریز کے نقطہ نظر سے ان فسادات کی ابتدا یُوں ہوئی کہ مسلمانوں نے چونکہ سرسید کی رہنمائی

میں کانگریس سے علحدہ رہتے ہوئے اپنے لئے جُداگانہ راہ عمل اختیار کرلی تھی اِس لئے ہندو عوام مسلمانوں کے دشمن ہو گئے۔ اور اس دشمنی نے رفتہ رفتہ فرقہ وارانہ ہنگاموں کی صورت اختیار کر لی۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ ان فسادات کا محرکِ اوّل خود انگریز تھا۔

ہندوستان میں ہندو اور مسلمان ایک ہزار سال سے ایک ساتھ زندگی گذار رہے تھے۔ ان میں جہاں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ وہاں اختلافات بھی تھے۔ لیکن اس کے باوجود گذشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ میں کبھی ہندو اور مسلمانوں میں فساد ہونا تو درکنار معمولی سا ہنگامہ بھی نہیں ہوا۔ لیکن جُوں ہی انگریز بہادر کے ہندوستان میں قدم آئے تو یہ آپسمیں ایک دوسرے کا خون بہانے لگے۔ آخر اس کی تہ میں کونسا راز تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۹۳ء کا پہلا فرقہ وارانہ فساد اِس لئے نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں کے کانگریس میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے ہندو مسلمانوں سے خفا ہو گئے تھے بلکہ اس کا بڑا باعث خود انگریز تھا جس نے کچھ تو کونسل کے کھلونے کے ذریعے اور کچھ دوسرے اسباب کی بناء پر ہندو اور مسلمانوں کے جذبات کو اس قدر مشتعل کر دیا کہ وہ خانہ جنگی میں مبتلا ہونے کے بعد اپنے اصل مقصد سے ہٹ گئے۔ اور انگریز کو مزے کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کرنے کے مواقع حاصل ہو گئے۔

انگریزوں کی اس لگائی ہوئی آگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۳ء میں اعظم گڈھ اور دوسرے مقامات پر قربانی گاؤ کے نام پر بقر عید پر خوب ہنگامے برپا ہوئے بمبئی میں تعزیوں کی آڑ لیکر ہندو مسلمانوں نے خوب ایک دوسرے کا خون بہایا۔ مہاراشٹر کے لیڈر گنگادھر تلک کو جب زیادہ جوش آیا تو انھوں نے ذبیحہ گاؤ کو روکنے کے لئے

ایک مستقل انجمن بنا ڈالی۔

ہندو اور مسلمانوں کی یہ ہنگامہ آرائی صرف اسی حدود تک محدود نہیں رہی۔ بلکہ انگریزوں کی عنایت سے اُردو زبان کے خلاف بھی ایک محاذ قائم کر دیا گیا چنانچہ اُردو کے مقابلہ میں دیوناگری کو سرکاری زبان بنوانے کے لئے کوششیں شروع ہوگئیں غرضکہ ہندوستان میں مذہب اور زبان کے نام پر بُری طرح سے فرقہ پرستی کی آگ بھڑکا دی گئی۔ انگریز خوش تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کی خانہ جنگی کی وجہ سے اُس کی حکومت کی بُنیادیں مستحکم ہوتی چلی جارہی ہیں۔

مسلم پولٹیکل ایسوسی ایشن کا قیام

انگریز کی عنایت سے اب چونکہ ہندو مسلمان کھلّم کھلا ایک دوسرے کے مقابلہ پر میدان میں آگئے تھے۔ اس لئے مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ اب اُن کا کام سیاسی انجمن کے قیام کے بغیر چلنا ناممکن ہے۔ چنانچہ سیاسی انجمن کے قیام پر غور و خوض شروع ہوگیا۔ ایجوکیشنل کانفرنس اگرچہ ۱۸۸۶ء سے مسلمانوں کے سیاسی پلیٹ فارم کا کام دے رہی تھی۔ لیکن فرقہ وارانہ فسادات اور کونسلوں کی توسیع نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک ایسی آل انڈیا انجمن قائم کریں۔ جو سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کرسکے اور اب چونکہ غدر کو بھی کافی عرصہ گذر چکا تھا اور انگریز سیاسی تحریکوں کو بھی برداشت کرنے لگا تھا۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے سیاسی انجمن کے قیام میں کوئی خطرہ بھی نہ تھا۔ غرضکہ ۱۸۹۴ء میں سرسیّد کے دست راست نواب محسن الملک نے مسلم پولٹیکل ایسوسی ایشن کے نام سے مسلمانوں کی سب سے پہلی سیاسی انجمن کی بُنیاد رکھ دی۔

یہ انجمن چونکہ ایسے زمانہ میں قائم کی گئی تھی۔ جبکہ انگریز کی عنایت سے ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا نہایت مکدّر تھی۔ اس لئے انجمن میں سب سے پہلے ہندو مسلم

سوال پر غور کرنے کے بعد یہ طے کیا گیا کہ مسلمان بحالتِ موجودہ ہندوؤں کے ساتھ ملکر کام نہیں کر سکتے۔ نیز انجمن نے حکومت کے سامنے مسلمانوں کے جداگانہ مطالبات کے پیش کرنے کا بھی فیصلہ کر دیا۔ غرضکہ نواب محسن الملک اور دوسرے مقتدر مسلم لیڈران نے مسلم پولٹیکل کانفرنس کے ذریعہ آزادانہ اپنے خیالات اور مسلمانوں کے مطالبات کا اظہار شروع کر دیا۔

پنجاب اور بنگال کی تقسیم

ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں جو تفریق پیدا ہو رہی تھی اُسے دیکھتے ہوئے انگریز ہندوستان کے اندرونی معاملات سے تو تقریباً بالکل بے فکر ہو گیا تھا۔ لیکن اُسے سرحد کے آزاد قبائل کا خطرہ ہمیشہ پریشان رکھتا تھا اور ایسی حالت میں جب کہ سرحدیوں میں اور انگریزوں میں ۱۸۹۷ء میں خوفناک جنگ چھڑ چکی تھی تو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن نے فوجی مصلحتوں کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ پنجاب کے شمالی سرحدی علاقہ کو پنجاب سے علحدہ کرنے کے بعد ایک علحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء میں سرحدی علاقہ کو پنجاب سے کاٹنے کے بعد ایک نئے صوبہ کی بنیاد رکھ دی گئی۔ لہٰذا آج بھی یہ صوبہ سرحدی صوبہ کے نام سے پاکستان کا ایک مستقل صوبہ ہے۔

لارڈ کرزن نے انتظامی مصلحتوں کے لئے یا سیاسی اغراض کی خاطر جس طرح پنجاب کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا بالکل اسی طرح ۱۹۰۵ء میں بنگال کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ چنانچہ مشرقی بنگال اور آسام کو ملا کر مشرقی بنگال کے نام سے ایک نیا صوبہ بنا دیا گیا۔ ڈھاکہ اُس کا صدر مقام قرار پایا۔ بقیہ حصہ کو مغربی بنگال کا ایک مستقل صوبہ بنا دیا گیا۔ جس کا صدر مقام کلکتہ تھا۔

اس تقسیم سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو جو اکثریت میں تھے فائدہ پہنچتا تھا لیکن بنگالی ہندو اس تقسیم سے خوش نہ تھے چنانچہ انھوں نے اس تقسیم کے خلاف زبردست

تحریک شروع کر دی۔ مسلمانوں نے اگرچہ بنگالی ہندوؤں کی اس تحریک کے خلاف اور تقسیم بنگال کے حق میں کوئی تحریک جاری نہیں کی لیکن پھر بھی انھوں نے تقسیم بنگال کی مخالفت کی تحریک پر انتہائی ناگواری محسوس کی۔ غرضکہ بنگال کے اس جھگڑے نے ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات کو اور بھی کشیدہ کر دیا۔ اور شاید اس تقسیم سے انگریز کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ تقسیم بنگال کا فتنہ اُٹھا کر ہندو اور مسلمانوں میں زبردست تصادم برپا کر دے۔ لیکن مسلمان چونکہ عملی طور پر ہندوؤں کے مقابل نہیں آئے۔ اسلئے اس تقسیم کی بناء پر ہندو اور مسلمانوں میں خونریزی تک نوبت نہ پہنچ سکی۔ یعنی انگریز کا دلی مقصد پورا نہ ہو سکا۔

انگریز کیلئے پنجاب میں شدید پریشانی

انگریز اس بات سے تو خوش تھا کہ اُس کے بنائے ہوئے پروگرام کے مُطابق ہندوستان کے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے دن بدن دُور ہوتے چلے جا رہے ہیں لیکن ۱۹۰۶ء میں پنجاب میں کسانوں کی تحریک جب پورے زور شور کے ساتھ جاری ہوئی تو انگریز کو سارا شمالی ہند خطرہ میں دکھائی دینے لگا۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ عوام نے مشتعل ہو کر راولپنڈی میں سرکاری عمارتوں اور ڈاک خانہ پر حملہ کر دیا۔ حکومت کی فوجیں فوراً حرکت میں آگئیں۔ اس تحریک کو بُری طرح کچلا گیا۔ لیڈروں کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ سردار اجیت سنگھ اور لالہ راجپت رائے کو جلاوطن کر دیا گیا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام

ہندوستان میں اگرچہ بڑی حد تک بیداری پیدا ہو چکی تھی لیکن پھر بھی انگریز کی عنایت سے ہندوستان میں ایسی فضا اور حالات پیدا کر دئے گئے تھے کہ ہندو اور مسلمان ملک کی آزادی کے لئے متحد ہونے کی بجائے اپنے اپنے مُطالبات کے لئے جداگانہ راہِ عمل اختیار کر رہے تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں نواب محسن الملک

کی سرکردگی میں مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے شملہ میں ملا۔ اور اس وفد نے وائسرائے ہند کو بتایا کہ چونکہ ہندوستان میں جدید اصلاحات نافذ ہونے والی ہیں۔ اس لئے مسلمان چاہتے ہیں کہ اُن کے لئے جُداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کر لیا جائے۔ کونسلوں میں اُن کے لئے نشستیں مخصوص کر دی جائیں اور سابق حکمران قوم ہونے کی بنا پر مسلمانوں کے حقوق کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے وائسرائے ہند نے مسلمانوں کے مطالبات پر ہمدردانہ طریقہ پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔

اس زمانہ میں چونکہ ایک طرف تو تقسیم بنگال کا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دوسری طرف بہت سے اہم سیاسی مسائل بھی درپیش تھے۔ اس لئے نواب محسن الملک اور دوسرے مسلم لیڈروں نے یہ طے کیا کہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسی جدید سیاسی انجمن کی بُنیاد رکھی جائے۔ جو ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کو ایک مرکز پر اور ایک جھنڈے تلے جمع کر سکے چنانچہ اس مقصد کے پیشِ نظر نواب ڈھاکہ کی دعوت پر دسمبر ۱۹۰۶ء میں نواب وقار الملک کی زیرِ صدارت ڈھاکہ میں ہندوستان کے تمام متقدر مسلمانوں کا ایک نہایت ہی اہم جلسہ منعقد ہوا۔ اور اس جلسہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بُنیاد رکھ دی گئی۔ لیگ کے قیام کے سب سے بڑے محرک نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک، نواب ڈھاکہ اور مولانا محمد علی تھے۔ سر آغا خان لیگ کے مستقل صدر چُن لئے گئے۔ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک سکریٹری بنے۔ لیگ کی پالیسی بھی شروع میں کانگریس کی طرح معتدل تھی۔

لیگ کے قیام کے بعد ۲۹ دسمبر ۱۹۰۷ء کو کراچی میں لیگ کا پہلا سالانہ اجلاس ہوا۔ اس اجلاس کے صدر آدم جی پیر بھائی تھے۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے تقریباً تمام متقدر مسلمانوں نے شرکت کی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ دونوں مقامات

جہاں شروع میں لیگ کا احیا ہوا۔ یعنی ڈھاکہ اور کراچی۔ وہی آگے چل کر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے دارالسلطنت قرار دیئے گئے۔

کراچی کے اجلاس کے بعد لیگ کا ایک خاص اجلاس ۱۹۰۸ء میں علی گڈھ میں ہوا۔ اِس اجلاس کے صدر محمد شاہ دین بیرسٹر لاہور تھے۔ شیخ عبدالقادر میاں فضل حسین، نواب وقارالملک، سید نبی اللہ بیرسٹر اور دوسرے ملک کے ممتاز لیڈر بھی اِس اجلاس میں شریک تھے۔ پھر ۱۹۰۸ء میں جب لیگ کا اجلاس امرتسر میں ہوا تو سرسی امام اجلاس کے صدر تھے۔ اس اجلاس میں منٹو مارلے اصلاحات پر غور کیا گیا اور مخلوط انتخاب کو مسلم مفاد کے خلاف قرار دیتے ہوئے جُداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا گیا۔ نیز حکومت سے کہا گیا کہ کونسلوں۔ ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں میں مسلمانوں کی نشستیں مخصوص کی جائیں۔ اِس اجلاس میں مخلوط انتخاب کے خلاف مولانا محمد علی کی تقریر خاص اہمیت رکھتی تھی۔

منٹو مارلے اصلاحات

ہندوستان میں سیاسی بیداری برابر بڑھ رہی تھی۔ حکومت پر آزادانہ نکتہ چینی کا دور شروع ہو چکا تھا۔ انقلاب پسند بھی میدان میں آ گئے تھے۔ حکومت نے ۱۸۹۲ء میں ہندوستانیوں کا دل بہلانے کے لئے کونسلوں کا جو کھلونا عطا کیا تھا۔ اُس پر کئی سال سے سخت نکتہ چینی ہو رہی تھی۔ ہندوستانیوں کی اس نکتہ چینی سے نجات حاصل کرنے کے لئے ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات کی نئی قسط ہندوستانیوں کو عطا کی گئی۔

یہ اصلاحات چونکہ وائسرائے ہند منٹو اور وزیر ہند مارلے کی کوششوں سے ملی تھیں۔ اس لئے منٹو مارلے اصلاحات کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ان اصلاحات کے بعد ہندوستان کی کونسلوں میں مندرجہ ذیل اہم تبدیلیاں عمل میں آئیں۔

وائسرائے کی قانون ساز کونسل کے ممبروں کی تعداد بڑھا دی گئی لیکن تعداد

کے بڑھنے کے باوجود کثرت سرکاری ممبروں ہی کی رہی۔ صوبوں کی قانون ساز کونسلوں میں بھی ممبروں کی تعداد بڑھا دی گئی اور یہ عنایت کی گئی کہ غیر سرکاری ممبروں کی تعداد سرکاری ممبروں سے زیادہ کر دی گئی۔ کونسلوں میں مسلمانوں کی جُداگانہ نیابت کے حق کو تسلیم کر لیا گیا۔ کونسلوں کے اختیارات بھی بڑھا دئے گئے۔ وائسرائے کی انتظامیہ کونسل اور صوبجاتی انتظامی کونسلوں میں ایک ایک ہندوستانی ممبر کے لئے جانے کی سفارش کی گئی۔

اتحاد کانفرنس الہ آباد

مسلمانوں نے چونکہ گذشتہ چند سال کے اندر غیر معمولی سیاسی اہمیت حاصل کر لی تھی اور منٹو مارلے اصلاحات بھی ہندوستان کو مل گئی تھیں۔ اس لئے یہ ضروری سمجھا جانے لگا تھا کہ ہندو مسلمانوں کے اس باہمی افتراق کو جلد سے جلد دُور کر دیا جائے جس سے ملک کی ترقی کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔

اس مقصد کے ماتحت ۱۹۱۱ء میں کانگریس کے اجلاس کے بعد ایک اتحاد کانفرنس الہ آباد میں منعقد کی گئی۔ اس اتحاد کانفرنس میں ہندو اور مسلمانوں کے تقریباً سو لیڈروں نے شرکت کی۔ شرکاء میں قابلِ ذکر ہندو لیڈر یہ تھے۔ سر سریندر ناتھ بنرجی۔ گوکھلے۔ سر سندر لال۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ پنڈت مدن موہن مالویہ۔ سر تیج بہادر سپرو۔ لارڈ سنہا۔ مہاراجہ دربھنگہ۔ مسلمان مقتدر لیڈروں میں سے قابلِ ذکر حضرات یہ ہیں:۔ سر آغا خاں۔ نواب وقار الملک بہادر۔ سر ابراہیم رحمت اللہ۔ مسٹر محمد علی جناح مسٹر حسن امام۔ مولٰنا محمد علی۔ حکیم اجمل خاں۔ مسٹر شفیع احمد بار ایٹ لا۔ مولوی رفیع الدین احمد بار ایٹ لا۔

اس اتحاد کانفرنس میں ایک کمیٹی بنا دی گئی جس کی ذمہ داری یہ تھی کہ ہندو اور مسلمانوں میں اتحاد کرائے۔ مقدمہ بازی کو گھٹائے۔ ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے

کے بائیکاٹ سے روکے۔ اُردو ہندی کے جھگڑے کو ختم کرے میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا خیال رکھے۔ سود کی شرح میں کمی کرائے۔ رہن رکھی ہوئی جائدادوں کی جبریہ فروخت کو بند کرے۔ آریہ سماج کو اشتعال انگیزی سے روکے۔ گائے اور باجے کے جھگڑے کو ختم کرائے اور ہندوؤں کو ایسے عمل پر زور دینے سے روکے جو مسلم اقلیت کے لئے مضر ہوں۔

یہ اتحاد کانفرنس نہایت ہی بلند مقاصد لے کر میدان میں آئی تھی۔ لیکن فرقہ پرست لیڈر جو کسی قیمت پر بھی اتحاد کے لئے رضامند نہ تھے انھوں نے اپنی اشتعال انگیزی سے چند ماہ کے اندر اندر اتحاد کی ساری کوششوں کو ختم کر دیا۔ انگریز خوش تھا کہ اُسے سب سے بڑے حادثہ سے یعنی ہندو مسلم اتحاد کے خطرہ سے نجات مل گئی۔

دہلی کا دربار اور تقسیم بنگال کی منسوخی

اتحاد کانفرنس کے چند ہی ماہ بعد دہلی میں شاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کا تاریخی دربار ۱۲ ردسمبر ۱۹۱۱ء کو منعقد ہوا۔ اس دربار میں شاہ جارج پنجم اور ملکہ میری نے بنفس نفیس شرکت کی تھی۔ بادشاہ نے اس دربار کے موقع پر اعلان کیا کہ آئندہ سے کلکتہ کی بجائے دہلی ہندوستان کا دارالسلطنت ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ہی بادشاہ نے تقسیم بنگال کی منسوخی کا بھی اعلان کر دیا۔

تقسیم بنگال کی منسوخی چونکہ ہندوؤں کی بہت بڑی سیاسی فتح تھی۔ اس لئے ہندوؤں میں تو اس پر بے حد خوشی کا اظہار کیا گیا۔ لیکن مسلمان جن کو اس تقسیم کی منسوخی سے سخت نقصان پہنچ گیا تھا۔ اُنھیں بے حد مایوسی ہوئی اور مسلمانوں نے سمجھ لیا۔ انگریز کو صرف طاقت کے بل پر ہی جھکایا جا سکتا ہے۔ غرضکہ تقسیم بنگال کی منسوخی نے مسلمانوں میں حکومت کے خلاف نئی سرگرمی پیدا کر دی اور اب وہ مسلمان بھی میدان سیاست

میں دکھائی دینے لگے جو پرلے درجہ کے انگریز پرست تصور کئے جاتے تھے یعنی تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو وقتی نقصان تو پہنچا لیکن اس ضرب سے وہ پہلے سے بھی زیادہ چونکتے اور بیدار ہو گئے۔

حکومت کے خلاف مسلمانوں کا غصہ

لیگ کا پانچواں سالانہ اجلاس جب ۱۹۱۲ء میں کلکتہ میں ہوا تو مسلمانوں کی روش حکومت کی طرف سے بالکل بدلی ہوئی تھی۔ وہی مسلمان جو انگریز کے خلاف دب دب کر تقریریں کیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے بڑی آزادی کے ساتھ تقسیم بنگال کو سامنے رکھ کر انگریزوں کو کھری کھری سُنانی شروع کر دیں۔ کلکتہ کے اس اجلاس کی ایک یہ بھی خصوصیت تھی کہ مسٹر محمد علی جناح جو اس زمانہ میں کانگریس کے مقتدر لیڈر تھے۔ لیگ کے اس اجلاس میں پہلی مرتبہ بطور وزیٹر کے شریک ہوئے تھے مسٹر محمد علی جناح کی اس اجلاس میں شرکت کا مقصد یہ تھا کہ آپ لیگ اور کانگریس کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ غرضکہ لیگ کا یہ اجلاس انگریزوں کی مخالفت کے اعتبار سے لیگ کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا اجلاس تھا۔

تقسیم بنگال کے بعد پے در پے ایسے حادثات رُونما ہوتے چلے گئے کہ مسلمانوں کی مخالفت انگریزوں کے خلاف بڑھتی ہی چلی گئی۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں یورپ کی بلقانی ریاستوں نے ٹرکی پر حملہ کر کے اُس کو یورپین مقبوضات سے محروم کر دیا اور انگریز ترکوں کے مخالفین کی برابر امداد کرتے رہے تو مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا۔ اسی زمانہ میں چونکہ کانپور کی مسجد کے سلسلہ میں مسلمانوں پر گولیاں چلائی گئی تھیں۔ اس لئے اس واقعہ نے مسلمانوں کو انگریزوں سے سخت متنفر کر دیا تھا یعنی مسلمانوں کی قومی بیداری کا باعث جہاں دوسرے اسباب تھے۔ وہاں جنگ بلقان اور مسجد کانپور کے واقعہ نے بھی مسلمانوں میں غیر معمولی جوش اور

زندگی پیدا کر دی تھی۔

مسلمان اب انگریز کی مخالفت میں اس قدر کمربستہ تھا کہ ہندو مسلم جھگڑوں کو اُس نے قطعی فراموش کر دیا تھا۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۹۱۳ء میں لیگ کا اجلاس آگرہ میں ہوا تو مسلمانوں نے مسٹر جناح کے کہنے پر جُداگانہ نیابت کے مُطالبہ تک کو نظر انداز کر دیا تھا۔ غرضکہ انگریز نے اپنی پے درپے حماقتوں سے مسلمانوں کو بُری طرح مشتعل کر دیا تھا۔

پہلی جنگِ عظیم سے لیگ اور کانگریس میں اتحاد

پہلی جنگِ عظیم جو ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی تھی۔ اگرچہ دنیا کے دوسرے حصّوں کے لئے تو تباہی اور بربادی کا پیغام لیکر آئی لیکن یہ ہندوستان کے لئے اس لحاظ سے نیک فال ثابت ہوئی کیونکہ جنگِ عظیم کے چھڑنے کے بعد سے ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں محبت اور یگانگت کا ایک ایسا دور شروع ہو گیا جو ہندوستان کی تاریخ میں سنہری دور کے نام سے مشہور ہے۔

۱۹۱۱ء کی اتحاد کانفرنس اگرچہ ناکام ہو گئی تھی لیکن پھر بھی اس نے ہندو اور مسلمانوں میں اتحاد کا بیج بو دیا تھا۔ چنانچہ سال بسال ماہ بماہ اور دن بدن ہندو اور مسلمان قریب سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔ اتحاد کی ان کوششوں کے علاوہ ہندو اور مسلمانوں کو متحد کرنے میں انگریز کی اس معاندانہ روش کو بھی بے حد دخل تھا جس نے کہ پے درپے ہندوستانیوں پر ضربیں لگا کر ہندوستانیوں کی آنکھیں کھول دی تھیں۔

مسٹر جناح جو زمانہ دراز سے لیگ اور کانگریس کو قریب لانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے انھوں نے ہندو اور مسلمانوں کے بھڑکے ہوئے جذبات

سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا چنانچہ مسٹر جناح کی کوششوں سے یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ لیگ اور کانگریس کے اجلاس ایک ساتھ ایک ہی شہر میں ہونے لگے۔ گویا کانگریس اور لیگ نام کے لئے تو دو جُداگانہ جماعتیں تھیں۔ لیکن درحقیقت وہ ایک ہی تھیں۔ کانگریسی لیڈر لیگ کے پلیٹ فارموں پر تقریریں کرتے تھے اور لیگی لیڈر کانگریس کے پلیٹ فارم سے نعرۂ آزادی بلند کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں لیگ اور کانگریس کا اجلاس ایک ساتھ بمبئی میں منعقد ہوا۔ اور اس کے بعد کئی سال تک یہی سلسلہ جاری رہا۔

مسلمانوں کا غیر معمولی سیاسی جوش

جوں جوں انگریز کی دسیسہ کاریاں بڑھتی جارہی تھیں ہندو مسلم اتحاد قوی سے قوی تر ہوتا چلا جارہا تھا۔ لیڈروں کی گرفتاریوں نے مسلمانوں میں خصوصاً اور غیر مسلموں میں عموماً ایک نیا سیاسی جوش پیدا کردیا تھا۔ مولانا محمد علی کو جب ۱۹۱۶ء میں آوازِ حق بلند کرنے کے جرم میں نظر بند کیا گیا تو مسلمانوں کے جوش کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ اسی طرح ہوم رول کی تحریک کی لیڈر مسز اینی بسنٹ کی نظربندی پر مسلمانوں نے غیر مسلموں سے زیادہ جوش کا اظہار کیا۔ ۱۹۱۷ء میں جب حکومت نے مسز اینی بسنٹ کو تو رہا کردیا اور مولانا محمد علی بدستور گرفتار رہے تو اس پر مسلمانوں نے شدید صدائے احتجاج بلند کی پھر جب مولانا ابوالکلام آزاد۔ حسرت موہانی۔ مولانا ظفر علی خاں گرفتار ہوئے تو مسلمان آپے سے باہر ہو گئے۔ ہندوؤں نے بھی ان لیڈروں کی گرفتاری پر اپنی انتہائی ناگواری کا اظہار کیا۔

اسی زمانہ میں انگریزوں نے جب مولانا محمود الحسن کو گرفتار کرکے جزیرہ مالٹا میں نظر بند کیا تو مسلمانوں کا سیاسی جوش اس قدر بڑھ گیا کہ ان کو قابو میں رکھنا

دشوار تھا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۹۱۸ء میں گوشہ نشین علماء اسلام بھی میدانِ سیاست میں کود پڑے اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ وہ مسلم اور ملکی مفاد کے لئے لیگ کے دوش بدوش جنگ کریں گے۔ اسی زمانہ میں جب مانٹی گو چیمسفورڈ رپورٹ ملک کے سامنے آئی تو لیگ اور کانگریس دونوں نے اسے مسترد کر دیا۔

لیگ انتہا پسندوں کی جماعت

لیگ ابتدا میں ایک معتدل جماعت تھی۔ اس کے بعد اس میں انگریز کی مخالفت اور گرمی پیدا ہوئی پھر ۱۹۱۹ء میں یہ انتہا پسندوں کی جماعت بن گئی تھی چنانچہ مسلم عوام اور لیگی کارکنوں کی جانب سے لیگی لیڈروں سے مطالبات شروع ہو گئے تھے۔ کہ وہ یا تو کفن باندھ کر میدان میں آئیں اور انگریز سے ٹکر لیں۔ ورنہ اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جائیں۔ صدر مسلم لیگ مہاراجہ محمود آباد اور جنرل سکریٹری سید وزیر حسین نے مسلمانوں میں یہ غیر معمولی جوش دیکھا تو وہ اپنے اندر جوشیلے مسلمانوں کی رہنمائی کی صلاحیت نہ دیکھتے ہوئے ۱۹۱۹ء میں لیگ کے عہدوں سے مستعفی ہو گئے۔ اور لیگ جوشیلے کارکنوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

حکومت کیلئے لیگ کا یہ غیر معمولی جوش اور ہندو مسلم اتحاد ایک مستقل مصیبت بنتا چلا جا رہا تھا حکومت نے مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کیا۔ مگر اس سے لیگ میں اور بھی جوش پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں لیگ اور کانگریس کے اجلاس ایک ساتھ امرتسر میں منعقد ہوئے۔ حکومت نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ یہ اجلاس منعقد ہی نہ ہوں جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو لیگ اور کانگریس کے اجلاسوں کو ناکام بنانے کی ہر امکانی کوشش کی گئی۔ لیکن حکومت کی ایک نہ چلی اور لیگ کا نہایت شاندار اجلاس حکیم اجمل خاں کی زیر صدارت ۱۹۱۹ء

میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مولانا شوکت علی نے ایسی پُر جوش تقریر کی جس سے سرکاری حلقوں میں ہلچل برپا ہوگئی۔

جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام کا حادثہ اسی تاریخی اجلاس کے بعد پیش آیا تھا۔ جس میں کہ جنرل ڈائر نے پُر امن ہندو مسلمانوں اور سکھوں پر اندھا دھند گولیاں چلائی تھیں۔ اسی زمانہ میں جنگِ عظیم کے خاتمہ کے بعد چونکہ ترکی کو انگریزوں نے بالکل ختم کر دیا تھا۔ اس لئے مسلمانوں کے سیاسی جوش کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مسلمانوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ مسلمان قوم کا ہر فرد اسلام اور وطن کیلئے ایک ایسا سپاہی بن گیا تھا۔ جو ادنیٰ اشارہ پر اپنی جان دینے کے لئے تیار تھا۔ غرضکہ یہ زمانہ مسلم لیگ کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔

رولٹ ایکٹ کے سلسلہ میں ہندوستانیوں کا قتلِ عام

گاندھی جی ۱۹۱۵ء میں دکھنی افریقہ سے کامیاب ستیاگرہ کے بعد ہندوستان واپس آچکے تھے۔ اور ہندوستان میں ستیاگرہ کی تحریک جاری کر کے ایک نئی زندگی اور رُوح پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۱۸ء میں گجرات میں اور اس کے بعد احمد آباد میں ستیاگرہ کر کے انگریز کے لئے ایک نئی پریشانی پیدا کر دی تھی۔ ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا کیونکہ نہایت خوشگوار تھی۔ اس لئے ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کو گاندھی جی پر یکساں اعتماد تھا۔ چنانچہ دونوں ہی اس ستیاگرہ میں حصّہ لے رہے تھے۔

اسی زمانہ میں انگریز نے ہندوستانیوں کی گردنیں کاٹنے کے لئے جب رولٹ ایکٹ کے نام سے ایک شرمناک قانون پاس کیا تو سارے ہندوستان میں ایک بے چینی برپا ہوگئی۔ چنانچہ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں رولٹ ایکٹ کے خلاف جب احتجاج کے طور پر ہڑتال کی گئی اور زبردست مظاہرہ کیا گیا۔ تو

فوج نے عوام پر اندھا دھند گولیاں چلائیں۔ لاہور میں مارشل لا جاری کر دیا گیا۔ انہی دنوں سر منوہر لال لالہ ہرکشن لال، سر گوکل چند نارنگ اور مسٹر دلیپ سنگھ اور دوسرے مقتدر حضرات کو حکومت نے گرفتار کر لیا تھا۔ غرضکہ ہندوستان کی سیاسی فضا میں اچھی خاصی گرمی پیدا ہو گئی تھی۔

امان اللہ خاں سے انگریزوں کی جنگ

ترکوں کے ساتھ انگریزوں نے جو زیادتیاں کی تھیں۔ اُن سے صرف مسلمانانِ ہند ہی متاثر نہ تھے بلکہ اسلامی حکومتوں میں بھی انگریزوں کے خلاف ناگواری پھیلی ہوئی تھی چنانچہ اسی ناگواری کا نتیجہ تھا کہ امیر حبیب اللہ خاں کے بعد جب اُنکا بیٹا امان اللہ خاں افغانستان کے تخت پر بیٹھا تو اُسکے تخت پر بیٹھتے ہی انگریزوں میں اور امان اللہ خاں میں کھینچا تانی شروع ہو گئی۔ اور اس کھینچا تانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں میں اور امان اللہ خاں میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ انگریزی فوج نے درۂ خیبر سے پیش قدمی کر کے ڈکہ پر قبضہ کر لیا اور امان اللہ خاں کے لائق جرنل نادر شاہ نے تھل کا علاقہ دبا لیا۔

ہندوستان کے حالات چونکہ بیحد نازک تھے اسلئے انگریزوں نے یہی مناسب سمجھا کہ کسی نہ کسی طرح امان اللہ سے صلح کر لی جائے۔ چنانچہ اگست ۱۹۱۹ء میں راولپنڈی کے مقام پر انگریزوں اور امان اللہ خاں میں صلح نامہ ہو گیا۔ اس صلح نامہ کی رُو سے انگریزوں نے افغانستان کی خود مختاری تسلیم کر لی۔ امان اللہ خاں کو براہِ راست دوسری حکومتوں سے تعلقات قائم کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔ غرضکہ ہندوستان کے خطرناک حالات کی بنا پر انگریزوں کو مجبوراً افغانستان کی سیادت سے دستکش ہونا پڑا۔

خلافت کی پُر زور تحریک

مولانا محمد علی رہا ہو چکے تھے اور محمد علی کی رہائی کے بعد جولائی ۱۹۱۹ء میں خلافت کمیٹی کی بُنیاد رکھی جا چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس کی تحریک بڑی تیزی کے ساتھ ملک میں آگے بڑھ رہی تھی گویا ہندو اور مسلم لیڈر یکساں طور پر انگریزوں کے لئے مصیبت بنے ہوئے تھے۔

ہندو مسلمانوں میں اسوقت تک بدستور کامل اتحاد تھا۔ اور مسلمانوں کے سیاسی جوش کا تو

یہ عالم تھا کہ وہ کانگریس، لیگ، خلافت کسی جماعت میں بھی کوئی فرق محسوس نہیں کرتے تھے۔ وہ جس طرح علی برادران کے دلدادہ تھے اُسی طرح گاندھی جی پر فریفتہ تھے۔ انکا مطمع نظر صرف یہ تھا کہ انگریز کے کاری ضرب لگائی جائے۔ چنانچہ علی برادران نے جب خلافت کے پلیٹ فارم سے انگریزوں کے خلاف نعرہ بلند کیا تو مسلمان اُدھر دوڑ گئے اور گاندھی جی نے عدم تعاون کا حکم دیا تو مسلمانوں نے سرکاری ملازمتیں چھوڑنی شروع کر دیں۔ انگریزی عدالتوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ انگریزی مال کو آگ لگا دی۔ غرضکہ انگریز کی مخالفت کا نعرہ جدھر سے بھی بلند ہوتا تھا مسلمان اُدھر ہی دوڑا چلا جاتا تھا۔ ہندوستان کا ہر لیڈر خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان مسلمانوں کا لیڈر تھا بشرطیکہ وہ انگریز کا شدید مخالف ہو۔

مسلمان اب اتنا جری ہو چکا تھا کہ نہ وہ جیل کوٹھری سے ڈرتا تھا اور نہ پھانسی کے تختے سے۔ چنانچہ جب گرفتاریوں کا دور شروع ہوا۔ تو مسلمانوں نے سب سے آگے بڑھ کر اپنے آپکو گرفتاریوں کیلئے پیش کیا۔ غرضکہ مسلمان انگریز کی مخالفت میں ایسا اندھا ہو رہا تھا کہ اگر ہندو مہا سبھا بھی اپنے پلیٹ فارم سے انگریز کے خلاف کوئی تحریک شروع کرتی تو وہ ہندو مہا سبھا کے جھنڈے تلے بھی جا کر کھڑا ہو جاتا۔ بس اُس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ ترکوں کی حمایت اور انگریز کی مخالفت۔

انگریز کی مخالفت کے جوش میں مسلمانوں نے ہندوؤں سے مزید اتحاد پیدا کرنے کیلئے قربانی گاؤ کے ترک کرنے کا اعلان کر دیا۔ جداگانہ انتخاب سے بھی اُسے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی اگر اُسے دلچسپی تھی تو انگریز سے اور اُسکی دشمنی سے۔ یہاں تک کہ اس نے انگریز کی مخالفت کے جوش میں مسلم لیگ کو بھی بھلا دیا۔ چنانچہ لیگ سے مسلمانوں کی بے اعتنائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال کے اندر اندر لیگ ایک مردہ جماعت بنکر رہ گئی۔ لیگ کے تمام لیڈر انگریز دشمنی کے جوش میں لیگ کا پلیٹ فارم چھوڑ چھوڑ کر کانگریس اور خلافت کے پلیٹ فارم پر جا پہنچے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا نفاذ

۱۹۱۹ء کے اس تاریخی سال میں جبکہ ہندوستانیں سیاسی تحریکیں خوب چمک رہی تھیں اور ہندوستانیوں کا سیاسی جوش انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ لندن ہائی کمانڈ نے محسوس کر لیا کہ اگر اسوقت ہندوستانیوں کو کچھ

اصلاحات نہ دی گئیں تو ہندوستانیوں کا قابو میں رکھنا ناممکن ہو جائیگا۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں ہندوستانیوں کو مزید اصلاحات کی قسط دینے کی غرض سے انڈیا ایکٹ پاس کیا گیا۔ چونکہ یہ اصلاحات مانٹی گو اور وائسرائے ہند چیمسفورڈ کی کوششوں سے ملی تھیں۔ اسلئے یہ تاریخ میں مانٹی گو چیمسفورڈ اصلاحات کے نام سے مشہور ہیں ۱۹۲۱ء میں اس جدید قانون کا ہندوستان میں نفاذ ہو گیا اور اسکی رُو سے ہندوستانیوں کو مندرجہ ذیل اصلاحات ملیں۔

مرکزی حکومت کے ایوان کے دو حصے کر دئے گئے۔ ایک کا نام کونسل آف اسٹیٹ اور دوسرے کا نام لیجسلیٹو اسمبلی رکھا گیا کونسل آف اسٹیٹ کے ممبروں کی تعداد ۶۰ رکھی گئی جنمیں اکثریت منتخب شدہ ممبروں کی تھی۔ وائسرائے کی انتظامی کونسل میں ہندوستانی وزرا کی تعداد ایک سے بڑھا کم از کم تین کر دی گئی لیکن وائسرائے کے مسترد شدہ قانون کو پاس کرنے اور پاس شدہ قانون کو مسترد کرنے کے وسیع اختیارات دیدئے گئے۔

وزیر ہند کی لندن کونسل میں ہندوستانی ممبروں کی تعداد بڑھا دی گئی اور وزیر ہند اور اسکے عملہ کی تنخواہ کا بار حکومت برطانیہ پر ڈالدیا گیا۔ لندن میں ہندوستان کی جانب سے ایک ہائی کمشنر مقرر ہونے لگا۔ اسکے علاوہ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ دس سال کے بعد ہندوستان کو مزید اصلاحات دیجائینگی غرضکہ انڈیا ایکٹ کے ذریعہ حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی حکومت میں حصہ لینے کے لئے ہندوستانیوں کیلئے کافی مواقع بہم پہنچا دئے! ور یہ سب کچھ اسلئے ہوا کیونکہ ہندوستانیوں کا سیاسی جوش حد سے متجاوز ہو چکا تھا اور ہندو مسلم اتحاد انگریز کیلئے ایک مستقل خطرہ بن گیا تھا۔

بہادر موپلوں کی بغاوت

جہاں تک خلافت کی تحریک کا تعلق ہے وہ تو ۱۹۲۱ء میں سرد پڑ گئی تھی۔ مسلمان کا بے پناہ سیاسی جوش بھی خلافت کے ساتھ ہی ٹھنڈا پڑ گیا تھا لیکن ان سب کا اثر جنوبی ہند میں یہ پیدا ہوا کہ جنوبی ہند کے بہادر موپلوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ انگریز نہ صرف ہندوستانیوں کی گردنوں پر چھری پھیر رہے ہیں بلکہ ترکوں کو بھی انھوں نے ذبح کر دیا ہے۔ موپلے اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔

موپلوں نے نہایت منظم طریقہ پر ۱۹۲۱ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت برپا کردی۔ وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ نے بہادر موپلوں کو کچلنے کیلئے فوراً اُن پر فوج چڑھادی۔ بہادر موپلوں نے بڑی جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا اور گولیاں کھائیں۔ غرضکہ موپلوں کا بُری طرح قتلِ عام ہوا۔ اور ان پر بے پناہ مظالم توڑے گئے۔

ہندو مسلم فسادات کا بدترین دور

گذشتہ سات آٹھ سال سے ہندو مسلم اتحاد کا جو زریں دور جاری تھا وہ ۱۹۲۲ء میں ختم ہوگیا۔ اور اچانک ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی ایک ایسی آگ بھڑک اُٹھی جو فرقہ وارانہ فسادات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ سخت تھی۔ چنانچہ گائے اور باجے کے نام پر ہندوستان کے کونے کونے میں شدید فرقہ وارانہ ہنگامے شروع ہوگئے۔ اور وہی ہندو مسلمان جو کل ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ انتہائی بے دردی کے ساتھ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگے۔ ہندوستان کے مقتدر لیڈروں نے ہرچند اس آگ کو بجھانا چاہا لیکن یہ دن بدن بھڑکتی ہی چلی گئی۔ انگریز خوش تھا کہ اُس نے ہندو اور مسلمانوں کے اُس کامل اتحاد کو توڑ دیا جس سے کہ وہ بُری طرح خوفزدہ تھا۔

اس فرقہ پرستی کی آگ کو بھڑکانے کے لئے کس قدر باقاعدہ طور پر انتظام کیا گیا تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حکومت نے بہت سے ہندو مسلم لیڈروں کو خرید لیا تھا۔ اخبارات کو روپیہ تقسیم کیا جارہا تھا۔ تاکہ وہ فرقہ پرستی کی آگ کو ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلادیں غرضکہ ہندو مسلم اتحاد کا زریں دور شدھی سنگھٹن۔ گائے۔ باجے۔ اُردو اور ہندی کے طوفان میں اس طرح ختم ہوگیا کہ پھر ہندوستان زمانہ دراز تک اس نعمت سے لُطف اندوز نہ ہوسکا۔

سیاسی جمود کا زمانہ

فرقہ پرستی کی وہ آگ جو پورے اہتمام کے ساتھ بھڑکائی گئی تھی۔ رفتہ رفتہ ملک کے کونے کونے میں پھیلتی چلی گئی۔ اور اس آگ میں ہندوستان کی تقریباً تمام سیاسی تحریکیں جھلس کر ختم ہوگئیں۔ خلافت تو پہلے ہی ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ ہندو مسلم فسادات نے کانگریس کے

زور کو بھی توڑ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پچھلے چند سال کے اندر کانگریس میں جو غیر معمولی زندگی پیدا ہوگئی تھی۔ اُس میں ان مسلمانوں کا بہت بڑا حصّہ تھا۔ جو نتائج کی پروا کئے بغیر بڑے سے بڑے خطرہ کو دعوت دینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ ہندو مسلم فسادات نے چونکہ کانگریس پر مہاسبھائی خیالات رکھنے والے ہندوؤں کو حاوی کر دیا تھا۔ اس لئے مسلمان ایک ایک کر کے کانگریس سے کھسکنے لگے اور کانگریس کی محفل بھی سونی دکھائی دینے لگی۔

مسلم لیگ کی حالت یہ تھی کہ جوشیلے مسلمان پہلے ہی اُسے چھوڑ کر خلافت اور کانگریس کی طرف چلے گئے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات اور سیاسی جمود نے اس کی رہی سہی حیثیت کو بھی ختم کر دیا۔ چنانچہ لیگ کے نام نہاد ممبروں کی تعداد ۱۹۲۲ء میں مشکل سے گیارہ سو تھی۔ اور ان گیارہ سو میں سے چندہ دینے والے بیس پچیس سے زیادہ نہ تھے۔ یعنی وہی مسلم لیگ جو ۱۹۱۹ء میں انتہائی عروج پر تھی۔ دو تین سال کے اندر ہی اندر ختم ہوگئی۔

لیڈروں کی کیفیت یہ تھی کہ مسٹر جناح خلافت کے جوش اور عدم تعاون کی تحریک کے زمانہ ہی سے کانگریس سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ مسٹر جناح کو کونسلوں اور اسکولوں و کالجوں کے بائیکاٹ کی تحریک سے شدید اختلاف تھا مسٹر جناح کی رائے تھی کہ کونسلوں میں گھس کر اور حکومت کے ایوان میں پہنچ کر حکومت کے ضرب لگائی جائے۔ لیکن گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی لیڈر مسٹر جناح سے متفق نہیں تھے۔ اس لئے مسٹر جناح کانگریس سے مستعفی ہوگئے۔

گاندھی جی شروع شروع میں تو عدم تعاون اور بائیکاٹ کی تحریکوں کو چلاتے رہے۔ لیکن جب یہ تحریکیں بھی فرقہ وارانہ فسادات کے طوفان میں دب گئیں تو گاندھی جی کو بھی مجبوراً گوشہ نشین ہونا پڑا۔ غرضکہ تقریباً تمام وہ لیڈر

جن کا فرقہ پرستی سے تعلق نہ تھا۔ ایک ایک کرکے سیاسیات سے الگ ہو گئے اور خاموشی کے ساتھ حالات کا انتظار کرنے لگے۔ اس کے بعد تقریباً چھ سات سال تک ہندوستان کی سیاسیات پر بالکل جمود طاری رہا۔ اور اس زمانہ میں انگریزوں کے ایجنٹ برابر فرقہ وارانہ آگ کو بھڑکا کر اچھی طرح سے ہندو مسلمانوں میں خونریزی کراتے رہے۔

سوراجیہ پارٹی کا قیام

فرقہ پرستی اور ہندو مسلم فسادات کے اس دور میں جبکہ ہندو اور مسلم لیڈر دل برداشتہ ہو چکے تھے ۱۹۲۳ء میں دیش بندھو داس نے سوراجیہ پارٹی قائم کی۔ تاکہ اس جدید پارٹی کے ذریعہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔ اس پارٹی کے عالم وجود میں آنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی۔ کیونکہ کانگریس پر وقتی طور پر ایک جمود کی سی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ اور انگریز کی حالت یہ تھی کہ وہ چن چن کر محبان وطن کو جیلوں میں ٹھونس رہا تھا۔ اور انقلاب پسند نوجوانوں کو پھانسی پر لٹکا رہا تھا سوراجیہ پارٹی ہندوستان میں کوئی بڑا کارنامہ تو انجام نہیں دے سکی۔ لیکن پھر بھی یہ جو کچھ کر سکتی تھی اس نے کیا اور ملک کو اس کے وجود سے فائدہ ہی پہنچا۔

سائمن کمیشن کی آمد

۱۹۲۷ء میں جب سائمن کمیشن ہندوستان آیا تو فرقہ پرستی کی لعنت اگرچہ ہندوستان میں موجود تھی لیکن اس میں پہلی سی گرمی باقی نہ تھی۔ سائمن کمیشن کے آنے کے بعد ہندوستان میں پھر سے سیاسی زندگی کے آثار پیدا ہو گئے اور وہ سیاسی جمود دور ہونے لگا جو ہندوستان پر گذشتہ چھ سات سال سے طاری تھا۔

سائمن کمیشن کی آمد کا مقصد یہ تھا کہ وہ ہندوستان کے سیاسی حالات کا مطالعہ کرے۔ ۱۹۱۹ء کے انڈیا ایکٹ کی رو سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ دس سال کے

بعد ہندوستان کو مزید اصلاحات دی جائیں گی۔ لہذا سائمن کمیشن یہ دیکھنے کے لئے آیا تھا کہ ہندوستانیوں نے سابقہ اصلاحات کو یہاں تک کامیاب بنایا ہے اور اب وہ مزید اصلاحات کی مستحق ہیں یا نہیں۔

ہندوستانی لیڈر اِس بات کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے فوراً ہی بعد ہندوستان میں فرقہ پرستی کی جو آگ انگریز نے بھڑکائی تھی۔ اُس کا اصل منشا کیا تھا۔ اور لیڈر یہ بھی جانتے تھے کہ ان فرقہ وارانہ ہنگاموں سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے کمیشن جو رپورٹ تیار کریگا وہ کیا ہوگی۔ اسکے علاوہ ہندوستانی لیڈروں کو اس پر بھی اعتراض تھا کہ سائمن کمیشن کے سارے ممبر انگریز تھے۔ اور اُن میں ایک بھی ہندوستانی نہ تھا۔ لہذا کانگریس اور لیگ دونوں نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا۔ اور اس کمیشن کے لیڈر سر جان سائمن کو مع اپنے ساتھی ممبروں کے ہندوستان سے ناکام اور نامراد واپس جانا پڑا۔

سائمن کمیشن کی آمد پر کانگریس کی تحریک پر سارے ملک میں احتجاجی ہڑتال ہوئی۔ سائمن کمیشن کے ممبر جہاں بھی گئے عوام نے مظاہرے کئے۔ بمبئی میں مسٹر جناح مظاہرین کے لیڈر تھے۔ پنجاب میں لالہ لاجپت رائے نے احتجاج کرنے والوں کی رہنمائی کی۔ لالہ لاجپت رائے پر لاٹھیاں برسائی گئیں۔ لالہ جی کی موت اسی ظالمانہ لاٹھی چارج کی بنا پر ہوئی۔ چنانچہ لالہ جی کی موت کے بعد عوام میں غیر معمولی جوش پیدا ہوگیا تھا۔

مسٹر جناح کے چودہ نکات

ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا اگرچہ ابھی تک مکدر تھی لیکن سائمن کمیشن کی آمد نے ہندوستان کے ذمہ دار لیڈروں میں یہ احساس پیدا کر دیا تھا کہ اُن کو ہر قیمت پر آپس کے جھگڑوں کو ختم کر کے متحد ہو جانا چاہیئے۔ مسٹر جناح جو مصالحانہ جدوجہد میں پیش پیش تھے انہوں

۱۹۲۹ء میں مسلمانوں کے کم سے کم مطالبات کا ایک خاکہ تیار کر دیا جو ہندوستان کی تاریخ میں "مسٹر جناح کے چودہ نکات" کے نام سے مشہور ہے تاکہ ان چودہ نکات کی روشنی میں ہندو مسلم اختلافات کا قضیہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ مسٹر جناح کے چودہ نکات یہ تھے:-

(۱) آئندہ دستور وفاقی اصول پر مبنی ہو گا۔

(۲) صوبوں کو کامل خود مختاری حاصل ہو گی اور ہندوستان کے تمام صوبوں کو بلا کسی استثنا کے اصلاحات دی جائیں گی۔

(۳) ملک کی مجالس آئین ساز کی تشکیل اس معینہ اصول پر ہو گی کہ ہر صوبہ میں اقلیتوں کو کافی اور موثر نیابت حاصل رہے اور کسی اکثریت کو گھٹا کر اقلیت یا مساوات تک نہ پہنچا دیا جائے۔

(۴) مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نیابت ایک تہائی سے کم نہ ہو۔

(۵) فرقوں کی نمائندگی و نیابت جداگانہ انتخاب کے اصول پر ہو گی جس طرح اب ہوتی ہے۔ البتہ ہر قوم مجاز ہو گی کہ اپنی خوشی سے اپنے اس قانونی حق سے دستبردار ہو جائے۔

(۶) ہندوستانی صوبوں کی تقسیم میں آئندہ کوئی ایسی تبدیلی نہیں کی جائے گی جس کا اثر صوبہ سرحد پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریتوں پر پڑے۔

(۷) تمام ملتوں کے لئے ضمیر و مذہب کی آزادی یعنی عقیدہ اور یقین کی آزادی عبادت و رسوم کی آزادی تعلیم و تبلیغ کی آزادی تنظیم و اجتماع کی آزادی تسلیم کی جائے۔

(۸) کوئی مسودہ قانون، قرار داد یا تحریک کسی مجلس قانون ساز میں منظور نہ ہو سکے گی اگر کسی قوم کے تین چوتھائی ممبران مجلس اسے اپنے قومی مفاد کے خلاف قرار دے دیں۔

(۹) سندھ کو بغیر کسی شرط کے بمبئی سے علحدہ کر کے ایک جدید صوبہ بنایا جائے۔

(۱۰) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات نافذ کی جائیں۔

(۱۱) حکومت کے ذمہ دار عہدوں اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو دوسری قوموں کے پہلو بہ پہلو صلاحیت اور کارکردگی کا لحاظ رکھتے ہوئے مناسب حصہ دیا جائے۔

(۱۲) دستور اساسی میں ایسے کافی تحفظات رکھے جائیں جن کی رُو سے اسلامی کلچر۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی حفاظت ترقی اور مسلمانوں کی تعلیم و زبان اور رسم الخط اور مذہبی پرسنل لا۔ اور اسلامی اداروں سے گرانٹ میں مناسب حصہ حاصل کیا جاسکے۔

(۱۳) کسی صوبہ کی کابینۂ وزارت کم سے کم ایک تہائی مسلم نیابت کے بغیر ترکیب نہ دی جائے یعنی ہر وزارت کی ترتیب میں ⅓ مسلم وزیروں کی شرکت ضروری ہو۔

(۱۴) دستورِ اساسی میں کوئی ترمیم یا تبدیلی اُس وقت تک نہ کی جائے جب تک کہ وفاق ہند کے سارے ممبر یعنی ہندوستان کے صوبے اور دیسی ریاستیں اُسے تسلیم نہ کرلیں۔

مسٹر جناح کے ان چودہ نکات پر غور و خوض شروع ہوگیا۔ آخر لیڈروں کی سخت جدوجہد کے بعد کانگریس نے ان مطالبات کو تسلیم کرلیا۔ لیکن ہندو مہاسبھا ان نکات سے سخت برہم تھی۔

نہرو رپورٹ اور جناح | قائدِ اعظم جناح کے ان چودہ نکات کے ذریعہ

مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کا مسئلہ تقریباً حل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ہندوستان کے سیاستدانوں نے یہ طے کیا کہ ہندوستان کے مدبّرین ایک دستور اساسی تیار کریں جسے ہندوستانیوں کے متّحدہ مطالبہ کی صورت میں حکومت کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اور اِس دستور کے بنانے کی اس لئے اور بھی ضرورت پیش آئی کیونکہ وزیر ہند برکن ہیڈ نے ہندوستانیوں کو افتراق کا طعنہ دیا تھا۔ ہندوستانیوں کا یہ افتراق چونکہ مسٹر جناح کے چودہ نکات کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ اس لئے اب ہندوستانی برکن ہیڈ کے اس طعنہ کا عملی جواب دے سکتے تھے۔

اِس دستور کی تیاری کے لئے پنڈت موتی لال نہرو کی زیر صدارت، ایک مجلس تشکیل دستور قائم کی گئی جس میں کہ کانگریسی اور غیر کانگریسی ممبر دونوں شامل تھے۔ چنانچہ یہ دستور نہرو رپورٹ کے نام سے تیار کیا گیا۔

اگست ۱۹۲۸ء میں جب یہ نہرو رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس لکھنؤ میں پیش کی گئی تو خلافت کی طرف سے مولانا شوکت علی نے اِس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان اس رپورٹ کو ہرگز منظور نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اسمیں مسلمانوں کا کوئی بھی اہم مُطالبہ منظور نہیں کیا گیا ہے۔ پنجاب میں انھیں اقلیت بنا دیا گیا ہے۔ بنگال میں ہندو اقلیت اُن پر مسلّط کر دی گئی ہے۔ سندھ کی علحدگی بھی واضح الفاظ میں تسلیم نہیں کی گئی ہے۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دینے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ غرضکہ اس رپورٹ پر مسلمانوں کی جانب سے شدید نکتہ چینی شروع ہو گئی۔

نہرو رپورٹ اگرچہ مسٹر جناح کے چودہ نکات کی منظوری کے فوراً بعد تیار ہوئی تھی۔ لیکن رپورٹ میں چونکہ مسٹر جناح کے بعض اہم مُطالبات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اس لئے مسلمانوں کی جانب سے اس رپورٹ کی شدید مخالفت شروع

ہوگئی۔ مسٹر جناح نے ہر چند کوشش کی کہ اس رپورٹ میں چند ضروری تبدیلیاں ہو جائیں لیکن مسٹر جناح کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔

مسلمانوں میں جب نہرو رپورٹ پر زیادہ ہیجان برپا ہوا تو مارچ ۱۹۲۹ء میں نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لئے لیگ کا ایک خاص اجلاس مسٹر جناح کی زیر صدارت دہلی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس نے کافی غور و خوض کے بعد نہرو رپورٹ کو مسترد کر دیا۔ سکھ لیگ اس سے قبل ہی اس رپورٹ کو مسترد کر چکی تھی۔ غیر برہمن اور اچھوت بھی رپورٹ کے مخالف تھے۔ مگر کانگریس نے نہرو رپورٹ کو منظور کر لیا۔ چنانچہ نہرو رپورٹ کی وجہ سے نہ صرف مسٹر جناح اور کانگریسی لیڈروں میں اختلافات بڑھ گئے بلکہ علی برادران بھی کانگریسی لیڈروں سے بے تعلق سے ہو گئے۔

مزدوروں میں بے چینی

انگریز اس چیز سے تو خوش تھا کہ اس نے ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں افتراق پیدا کرا کے اپنے آپ کو بڑی حد تک محفوظ کر لیا ہے لیکن جب وہ ہندوستان کے مزدوروں کی بڑھتی ہوئی بیداری پر نظر ڈالتا تھا تو کانپ جاتا تھا۔ کیونکہ ہندوستان کا مزدور فرقہ پرستی سے بلند ہو کر پوری طاقت کے ساتھ انگریز کے مقابلہ پر آ گیا تھا۔

مزدوروں کی یہ بے چینی اتنی بڑھی کہ انگریز کو ۱۹۲۹ء میں مزدور لیڈروں کو گرفتار کر کے ان پر میرٹھ میں مقدمہ چلانا پڑا۔ لیکن مزدوروں کی تحریک برابر آگے بڑھ رہی تھی۔ انقلاب پسند بھی مزدوروں کے ساتھ ہو گئے تھے۔ چنانچہ پنجاب میں بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھیوں نے لالہ لاجپت رائے پر لاٹھیاں برسانے والے سانڈرس کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد سردار بھگت سنگھ نے انگریزی

حکومت سے بیزاری کا اظہار کرنے کے لیئے مسٹر دت کی ہمراہی میں اسمبلی چیمبر میں بم پھینکا۔ انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ ان پر سازش کا مقدمہ چلایا گیا۔ آخر سردار بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

کانگریس کی جانب سے مکمل آزادی کا اعلان

ہندوستان کی بیداری کی تاریخ میں سنہ ۱۹۲۹ء کا سال اس کافی اہم ہے کیونکہ اسی سال پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں جب لاہور میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا تو اس اجلاس میں پہلی مرتبہ کانگریس کا نصب العین مکمل آزادی قرار دیا گیا۔

کانگریس کا نصب العین اِس سے قبل صرف نوآبادیاتی حکومت تک محدود تھا۔ چنانچہ مکمل آزادی کے اعلان کے بعد گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال کی سرگردگی میں جب آزادی کی تحریک پورے زور شور کے ساتھ شروع کی گئی۔ تو حکومتِ برطانیہ کو ہندوستان میں اپنی حکومت کی بُنیادیں ہلتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ اور انگریز ایک مرتبہ پھر ہندوستان کے مسئلہ پر پریشان اور سراسیمہ نظر آنے لگا۔ اس زمانہ میں ایک طرف تو ملک کی آزادی کی تحریک پورے زور شور سے جاری تھی اور دوسری جانب فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے بھی کوششیں ہو رہی تھیں۔

لندن کی پہلی گول میز کانفرنس

سائمن کمیشن کی ہندوستان سے ناکام واپسی اور فرقہ وارانہ اتحاد کی کوششوں کی بنا پر برطانوی مدبرین یہ سوچ رہے تھے کہ اگر شدید فرقہ وارانہ ہنگاموں کے باوجود بھی ہندو مسلمان متحد ہو گئے تو اُن کا کہاں ٹھکانا ہوگا لیکن جب برطانوی مدبرین کو یہ پتہ چلا کہ مسٹر جناح کے "چودہ نکات" بے معنی دستاویز

بن کر رہ گئے ہیں اور "نہرو رپورٹ" کی بنا پر پھر ہندو اور مسلمانوں میں افتراق کا فتنہ دوبارہ برپا ہو گیا ہے تو انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

سائمن کمیشن کے ہندوستان سے ناکام واپس آنے کے بعد لندن کے زعمار نے لندن میں ہندوستانی لیڈروں کی ایک گول میز کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں نے گول میز کانفرنس کے اعلان کا خیر مقدم کیا لیکن شرط تعاون یہ رکھی کہ گول میز کانفرنس میں کانگریس کے مندوبین کو اکثریت حاصل ہو۔ حکومت نے کانگریس کی شرط کو نہ مانا اور کانگریس کو نظر انداز کر کے دوسری جماعتوں کے افراد کے نام گول میز کانفرنس کے دعوت نامے جاری کر دئیے اور غالباً یہی انگریز چاہتا بھی تھا۔

نومبر ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں کانگریسی لیڈر تو شریک نہیں ہوئے۔ البتہ مہاسبھائی اور معتدلین بڑی تعداد میں موجود تھے۔ جن کا رویہ مسلمانوں کے لئے کافی دل شکن تھا لیکن اس کے باوجود مسٹر جناح نے مسلمانوں کی جانب سے اس بات کی پوری کوشش کی کہ حکومت کے سامنے ہندوستان کا متحدہ اور متفقہ مطالبہ پیش کیا جا سکے۔ چنانچہ مسلمان چند شرائط کے ماتحت مخلوط انتخاب تک ماننے پر تیار ہو گئے تھے۔ لیکن مہاسبھائیوں کی عنایت سے پھر بھی ہندو اور مسلمانوں میں سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اور یہ کانفرنس ناکام ثابت ہوئی۔

پاکستان کے حق میں پہلی آواز

مسٹر جناح کے چودہ نکات۔ نہرو رپورٹ اور گول میز کانفرنس کی ناکامی نیز دوسرے اہم سیاسی مسائل کی وجہ سے مسلم لیگ میں پھر نئے سرے سے زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں لیگ کا سالانہ

اجلاس جب علامہ اقبال کی زیر صدارت الہ آباد میں منعقد ہوا تو آپ نے اپنے خطبۂ صدارت میں ہندوستان کی فرقہ وارانہ کشیدگی اور ہندو مسلم سوال کی پیچیدگیوں پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے پہلی مرتبہ ہندوستان میں آزاد اسلامی حکومت یعنی پاکستان کا تخیل پیش کیا۔

علامہ اقبال چونکہ سیاسی لیڈر ہونے کی بجائے ہندوستان کے ایک نامور شاعر تھے۔ اس لئے اُن کے پاکستان کے اس تخیل کو بھی ایک شاعرانہ مضمون آفرینی سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ پاکستان کے قیام کے سلسلہ میں علامہ اقبال کے الفاظ یہ تھے:-

فرنگی جمہوریت سے کسی طرح بھی مسلمانوں کی حفاظت خود اختیاری کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک مسلمانوں کے مسئلہ کا بہترین حل اسلامی ہند کی تشکیل ہے۔ میری آرزو ہے کہ پنجاب صوبہ سرحد سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک جدید اسلامی سلطنت کے قیام کی کوشش کی جائے۔

ڈاکٹر اقبال کی رائے تھی کہ مسلمانوں کے مذہب، تمدن اور زبان کی حفاظت کا بہترین ذریعہ صرف یہ ہے کہ اس برِ عظیم کے اُس حصہ کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے مسلمانوں کا قومی وطن بنا دیا جائے۔ ڈاکٹر اقبال کے اسی نظریہ کے مطابق آگے چلکر مسٹر جناح نے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ اور اسی نظریہ کے ماتحت ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا۔

دوسری گول میز کانفرنس اور کمیونل اوارڈ

ہندوستان میں جب فرقہ وارانہ فضا بڑی حد تک درست ہو گئی اور مارچ ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی اور لارڈ اروِن کے مابین ایک سمجھوتہ بھی ہو گیا جو "گاندھی اروِن پیکٹ" کے نام سے مشہور ہے تو اس کے بعد

۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس میں گاندھی جی اور مسٹر جناح دونوں شریک تھے لیکن ملک کی بدقسمتی کہ انتہائی کوشش کے باوجود اس کانفرنس میں بھی فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہ ہو سکا۔

گاندھی جی اور ان کے رفقائے کار نے آخر مجبور ہو کر فرقہ وارانہ مسئلہ کے معاملہ میں انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کو ثالث بنا دیا اور یہ کہدیا کہ آپ جو کچھ طے کریں گے وہ ہمیں منظور ہوگا۔ چنانچہ ریمزے میکڈانلڈ نے اگست ۱۹۳۲ء میں بحیثیت ثالث کے جو فیصلہ دیا۔ وہ "کمیونل اوارڈ" کے نام سے مشہور ہے جس کی رُو سے مرکزی اور صوبائی کونسلوں میں مختلف فرقوں کی نشستیں مذہب اور قومیت کی بنا پر مقرر کر دی گئیں۔ ہندو مسلمانوں اور اچھوتوں کو علحدہ علحدہ نیابت دیدی گئی۔ انتخاب کا طریقہ جداگانہ رکھا گیا۔ اس کمیونل اوارڈ سے نہ ہندو مطمئن تھے نہ مسلمان اور نہ سکھ لیکن ایسی حالت میں جبکہ آپس میں بیٹھ کر کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا تھا تو اس کے مان لینے کے سوا اور چارہ کار ہی کیا تھا۔

کمیونل اوارڈ کے ذریعہ چونکہ اچھوتوں کو جداگانہ نیابت دیکر اعلیٰ ذات کے ہندوؤں سے علحدہ کر دیا گیا تھا۔ اس لیے گاندھی جی کو اس کمیونل اوارڈ میں تبدیلی کرانے کے لئے مرن برت رکھنا پڑا۔ آخر پونہ کے مقام پر اچھوت لیڈروں اور ہندوؤں میں باہمی سمجھوتہ ہو گیا۔ اور اچھوت ہندوؤں کے ساتھ مل گئے اور ان دونوں نے مشترکہ نیابت کو تسلیم کر لیا۔ ہندو اور اچھوتوں کے راضی ہونے کے بعد برطانیہ نے بھی کمیونل اوارڈ میں تبدیل کر دی۔ اور اس طرح پونہ پیکٹ کے ذریعہ اونچی ذات کے ہندو اور اچھوت گاندھی جی کی کوشش سے متحد ہو گئے۔

تیسری گول میز کانفرنس

کمیونل اوارڈ کا ثالثی فیصلہ نافذ کرنے کے بعد حکومتِ برطانیہ کے سامنے اہم ترین مسئلہ

یہ تھا کہ ہندوستان میں کیسی حکومت قائم کی جائے یعنی ہندوستان کے صوبے کامل طور پر خود مختار ہوں یا اُن کو فیڈریشن سے وابستہ کر دیا جائے۔ کانگریس اور لیگ دونوں جماعتیں فیڈریشن کی سخت مخالف تھیں۔ لیکن حکومت فیڈریشن کی حامی تھی۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ صوبوں کے ساتھ دیسی ریاستوں کو بھی فیڈریشن میں شامل کر لیا جائے تاکہ دیسی ریاستوں سے فیڈرل گورنمنٹ میں جو نمائندے آئیں برطانیہ اُن سے اپنے نامزد کردہ سرکاری ممبروں کا کام لے سکے۔

کانگریس اور لیگ چونکہ دونوں ہی جماعتیں فیڈریشن کی مخالف تھیں اس لئے جدید دستور کی تیاری کے سلسلہ میں ان سے مشورہ تک نہ لیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں جب لندن میں تیسری گول میز کانفرنس منعقد کی گئی تو اس کانفرنس میں شرکت کے لئے نہ تو کانگریس کو تکلیف دی گئی اور نہ لیگ کو بس برطانوی مدبرین اپنی من مانی کارروائی کرتے رہے۔

برطانوی مدبرین یہ چاہتے تھے کہ جس طرح کمیونل ایوارڈ کا ثالثی فیصلہ ہندوستانیوں کے سر تھوپ دیا گیا ہے۔ اسی طرح فیڈریشن کو بھی زبردستی تھوپ دیا جائے۔ چنانچہ برطانوی مدبرین نے ایسا ہی کیا۔

مسٹر جناح لیگ کے مستقل صدر

پہلی گول میز کانفرنس کے خاتمے کے بعد مسٹر جناح نے لندن میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور پریوی کونسل میں پریکٹس بھی شروع کر دی تھی وہ پارلیمنٹ کے ممبر بننے کے بعد ہندوستانیوں کے حقوق کے لئے انگریز کے گھر میں گھس کر جنگ کرنا چاہتے تھے۔

ہندوستان کی کیفیت یہ تھی کہ یہاں کے حالات بد سے بدتر صورت اختیار کرتے چلے جا رہے تھے۔ انڈیا ایکٹ کے ماتحت صوبوں کو آزادی ملنے والی تھی۔ اور مسلمان قوم ایک ایسی فوج بنی ہوئی تھی۔ جس کا کوئی سپہ سالار نہ تھا۔

چنانچہ مسلمانوں نے مسٹر جناح سے درخواست کی کہ وہ ہندوستان آئیں۔ اور مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔ مسٹر جناح اپنے چودہ نکات اور دوسری سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے مسلمانوں میں کافی ہر دلعزیز ہو چکے تھے۔

مسلمانوں نے ایک طرف تو مسٹر جناح کو لندن سے ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ اور دوسری طرف فروری ۱۹۳۴ء میں بمبئی سے مرکزی اسمبلی کے لئے مسٹر جناح کے کاغذات نامزدگی داخل کر دیئے۔ اور وہ بلامقابلہ لندن میں بیٹھے بیٹھے مرکزی اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہو گئے۔ چند روز بعد مسٹر جناح خود بھی ہندوستان آ گئے۔ ۱۹۳۴ء میں جب لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تو لیگی لیڈروں نے اُنھیں لیگ کا مستقل صدر منتخب کر لیا۔

مسٹر جناح نے ہندوستان آنے کے بعد پھر مفاہمت کی کوششیں شروع کر دیں۔ اُن کی رائے تھی کہ کانگریس جب تک مسلمانوں سے صلح نہیں کرے گی، اور مسلمان جب تک کانگریس سے معاملات طے نہ کر لیں گے حالات سازگار نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ مسٹر جناح کی مفاہمت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۳۵ء میں جناح راجندر فارمولا" تیار ہو گیا۔ لیکن ملک کی بدقسمتی کہ یہ فارمولا بھی چند روز کے بعد ردی کا ٹوکری بن کر رہ گیا۔

انڈیا ایکٹ کا نفاذ

سخت جدوجہد کے باوجود بھی ہندو مسلم مفاہمت نہ ہو سکی۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں نافذ کر دیا گیا۔ اس قانون کے نافذ ہونے کے بعد ہندوستان کے نظام حکومت میں جو اہم تبدیلیاں ہوئی تھیں وہ یہ ہیں:۔

مرکزی حکومت۔ مرکزی حکومت میں ایک آل انڈیا فیڈریشن قائم کرنے کی سفارش کی گئی تھی جس میں برٹش انڈیا اور ریاستی علاقے دونوں شامل

تھے۔ مرکزی حکومت میں ایک قسم کی دوعملی رائج کردی گئی۔ یعنی بعض محکمے تو گورنر جنرل کے ماتحت کردئے گئے اور بعض قومی وزرا کو عطا ہوئے۔ مثلاً فوج کا محکمہ امور خارجہ کا محکمہ اور گرجاؤں کا محکمہ تو گورنر جنرل اور اُس کی انتظامیہ کونسل کے تین ممبروں کے ماتحت کردیا گیا۔ اور باقی تمام محکمے نمائندہ وزرا کے حوالے کر دئے گئے۔ جن کی تعداد زیادہ سے زیادہ دس مقرر کی گئی۔ یہ وزرا مرکزی مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ تھے۔

مرکزی مجلس قانون ساز کے دو ایوان قائم کئے گئے۔ ایک کونسل آف اسٹیٹ اور دوسرا فیڈرل اسمبلی۔ کونسل آف اسٹیٹ کے ۲۶۰ ممبر رکھے گئے۔ یعنی ۱۵۰ برطانوی ہند کے منتخب نمائندے ۱۰۴ دیسی ریاستوں کے نامزد کردہ ممبر اور ۶ وائسرائے کے نامزد ممبر۔ فیڈرل اسمبلی کے کل ممبروں کی تعداد ۳۷۵ رکھی گئی۔ جن میں سے ۲۵۰ برطانوی ہند کے منتخب ممبر تھے جن کو صوبوں کی مجلس قانون ساز اپنے میں سے منتخب کرتی تھی۔ بقیہ ۱۲۵ ممبر دیسی ریاستوں کے نامزد کردہ ممبر تھے۔ فیڈرل اسمبلی کی میعاد پانچ سال رکھی گئی۔ کونسل آف اسٹیٹ ایک مستقل ایوان تھا۔ جس کے ایک تہائی ممبروں کو ہر تیسرے سال ریٹائر ہو جانا پڑتا تھا۔ وائسرائے کو آرڈی ننس جاری کرنے اور خاص موقعوں پر قانون نافذ کرنے کے وسیع اختیارات عطا کر دئے تھے۔

صوبجاتی حکومتیں:۔ صوبجاتی حکومتوں میں سے دوعملی کو اڑا کر انھیں خود مختاری دیدی گئی۔ یعنی تمام محکمے عوام کے نمائندہ وزرا کے حوالے کردئے گئے جو صوبجاتی مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ تھے۔

نئے نظام حکومت کی رُو سے ہندوستان میں گیارہ صوبے مقرر کئے گئے ان میں سے بمبئی۔ مدراس۔ یوپی۔ بہار۔ بنگال اور آسام کے چھ صوبوں میں

مجلس کے دو ایوان مقرر کئے گئے۔ جن کا نام لیجسلیٹو کونسل اور لیجسلیٹو اسمبلی رکھا گیا۔ باقی پانچ صوبوں میں لیجسلیٹو اسمبلی کا صرف ایک ہی ایوان رکھا گیا۔ لیجسلیٹو اسمبلیوں کی میعاد پانچ سال رکھی گئی۔ لیجسلیٹو کونسلوں کو مستقل ایوان قرار دیا گیا۔ لیکن ان کے ایک تہائی ممبروں کو ہر تیسرے سال ریٹائر ہو جانا پڑتا تھا۔

لیجسلیٹو اسمبلیوں کے تمام ممبر منتخب شدہ ہوتے تھے۔ سرکاری ممبروں کی نامزدگی منسوخ کر دی گئی۔ وائسرائے اور گورنر جنرل کی طرح صوبوں کے گورنروں کو وسیع اختیارات دئے گئے۔ ان کو آرڈی ننس جاری کرنے اور حسب ضرورت قانون بنانے کا بھی اختیار دیا گیا۔ ووٹروں کی تعداد بڑھا دی گئی۔ قانون ساز مجالس میں عورتوں کیلئے نشستیں مخصوص کر دی گئیں۔

چند دوسری تبدیلیاں:- برما کو ہندوستان سے الگ کر دیا گیا۔ سندھ اور اڑیسہ کے دو نئے صوبے بنا دئے گئے۔ فیڈرل کورٹ کی عدالتِ بالا قائم کی گئی جو ہائی کورٹوں کے خلاف اپیل سنتی تھی اور جو مرکزی حکومت صوبجاتی حکومتوں اور ریاستوں کے مابین متنازعہ معاملات میں فیصلہ دیتی تھی۔ ریزرو بنک قائم کیا گیا۔ جسے کرنسی نوٹ جاری کرنے کا حق دیا گیا۔

وزیر ہند کی انڈیا کونسل توڑ دی گئی۔ لیکن وزیر ہند کو صلاح و مشورہ کے لئے کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ چھ ممبر نامزد کرنے کا حق دیا گیا۔ ان ممبروں کے عہدوں کی میعاد پانچ سال رکھی گئی۔ کسی ممبر کو ایک مرتبہ سے زیادہ نامزد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ ہے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی اُن اصلاحات کا لب لباب جس کی رُو سے ہندوستان میں صوبجاتی خود مختاری کا نیا نظام قائم ہوا۔

صوبوں میں وزارتیں

۱۹۳۷ء کے شروع میں صوبائی مجالس قانون ساز کے انتخابات کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئے۔ تمام ہندو صوبوں میں کانگریس غیر معمولی اکثریت کے ساتھ تھی لیکن اس کے باوجود کانگریس نے وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ گورنروں سے یہ وعدہ لینا چاہتی تھی۔ کہ وہ وزارت کے کاموں میں مداخلت نہیں کریں گے۔ چنانچہ کانگریس اور حکومت میں جب ایک معاہدہ ہو گیا تو کانگریس نے وزارتیں قائم کر دیں اور اس طرح بمبئی۔ مدراس صوبہ سرحد۔ یوپی۔ بہار۔ صوبہ متوسط۔ اڑیسہ۔ آسام یعنی چھ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں بن گئیں۔ پنجاب میں ملی جلی وزارت بنی۔ صرف سندھ اور بنگال میں لیگی وزارتیں بن سکیں۔

فرقہ وارانہ فسادات کا نیا دور

برطانوی اصلاحات کی اسے برکت کہئے یا انگریز کی اسے شرارت سمجھئے کہ جب کبھی بھی ہندوستان میں نئی اصلاحات نافذ ہوئی ہیں اُن کے فوراً ہی بعد اس ملک کے ہندو اور مسلمانوں میں خونریزی کا دور شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات پر ۱۹۲۱ء میں عملدرآمد شروع ہوا تو وہی ہندو مسلمان جو اس سے قبل ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگے اور یہ خونریزی چھ سات سال تک برابر جاری رہی۔

۱۹۳۵ء کی اصلاحات کے بعد بھی یہی ہوا۔ چنانچہ جب ۱۹۳۷ء میں ان پر عملدرآمد شروع ہوا، اور صوبوں میں خود مختار قومی وزارتیں بن گئیں تو اچانک ملک میں فرقہ وارانہ ہنگامے پھوٹ پڑے۔ چنانچہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں گائے۔ باجے مسجد اور مندر کے نام پر وحشیانہ خونریزیاں شروع ہو گئیں۔ اور انسانوں نے انسان پر وہ بے پناہ مظالم کئے جن کو دیکھ کر درندگی بھی شرماتی تھی۔

بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ یہ گذشتہ فرقہ وارانہ بدمزگی کے نتائج ہیں اور

ہندو صوبوں میں اقلیتوں کے ساتھ غیر ہمدردانہ سلوک کا ردِ عمل ہے لیکن پس پردہ بھی اس کے علاوہ بہت کچھ تھا۔ انگریز کی دسیسہ کاریاں اپنا کام کر رہی تھیں۔ اور دنیا کو یہ دکھا رہی تھیں کہ ہندوستانی حکومت کرنے کے معاملہ میں قطعی نا اہل اور نالائق ہیں۔ اور ہماری حالت یہ تھی کہ ہم کٹ پتلی بنے ہوئے ایک عیار قوم کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔

دوسری جنگِ عظیم

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو یورپ میں دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ اور فرانس بھی میدان میں کود پڑے۔ جرمنی پولینڈ کو ختم کرنے کے بعد بجلی کی سرعت کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اور اس نے آن کی آن میں یورپ کی کئی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو ختم کر دیا۔ روس اور جرمنی میں دوستی کا معاہدہ ہو گیا۔ اور انگریزوں کی پوزیشن بے حد کمزور ہو گئی۔

جس زمانہ میں کہ یورپ میں جنگِ عظیم چھڑی ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات نہایت ہی ناخوشگوار تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے لے کر سن ۱۹۳۹ء کی دوسری جنگِ عظیم کے درمیان کا زمانہ وہ زمانہ تھا۔ جسے ہندو مسلم کشاکش اور کانگریس و لیگ کی رسہ کشی کا بدترین دور قرار دیا جا سکتا ہے۔

کانگریس اور لیگی وزارتیں اس زمانہ میں صوبوں میں برسرِ اقتدار تھیں۔ کانگریس نے حکومت برطانیہ کی نازک پوزیشن کو محسوس کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستان کی آزادی کا غیر مشروط طریقہ پر اعلان کر دے۔ کانگریس اور لیگ اگر اس وقت متحد ہوتیں تو حکومت برطانیہ آزادی کا اعلان کرنے پر مجبور تھی۔ لیکن کانگریس اور لیگ کے تعلقات چونکہ خوشگوار نہ تھے۔ اس لئے

حکومتِ برطانیہ نے ہندوستانیوں کی اس خانہ جنگی سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے کانگریس کے مطالبہ کو مسترد کر دیا جس پر مارچ ۱۹۳۹ء میں صوبوں کی تمام کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ کانگریسی وزرا کے مستعفی ہونے کے بعد دفعہ ۹۲ کے مطابق کانگریسی صوبوں میں گورنر راج قائم ہو گیا۔

حکومت کے لیے یہ نازک ترین وقت تھا۔ اُس نے گاندھی جی اور مسٹر جناح دونوں کو منانے کی کوشش کی لیکن یہ دونوں لیڈر چونکہ اپنے اپنے مطالبات پر اڑے ہوئے تھے۔ اس لئے حکومت ان کے منانے میں کامیاب نہ ہو سکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ۱۹۳۹ء کی جنگ میں ۱۹۱۴ء کی جنگ کی طرح ہندوستانی عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں ناکام رہی۔

لیگ کی جانب سے پاکستان کا مطالبہ

یورپ میں جنگِ عظیم کا زور بڑھتا جا رہا تھا اور ہندوستان میں فرقہ پرستی کی تبلیغ وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ باہمی مصالحت کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ اسی سبب کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی مسٹر جناح جو وحدتِ ہند کے سب سے بڑے حامی تھے۔ جنہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے انتھک کوششیں کی تھیں۔ اب ان کا نقطۂ نظر تبدیل ہو چکا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ڈاکٹر اقبال کے نظریہ کے مطابق ۱۹۴۰ء میں تقسیم ہند کی تجویز پیش کر دی۔

۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس کے ذریعہ "پاکستان" یعنی مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کی جداگانہ اسلامی حکومت کا مطالبہ پیش کر دیا گیا۔ اس قرارداد کا منظور ہونا تھا کہ چاروں طرف سے مسٹر جناح پر یورش شروع ہو گئی۔

اور چند ماہ کے اندر اندر ہندوستان کا سب سے بڑا سیاسی موضوع "پاکستان" بن گیا۔ اخبارات کے کالم پاکستان کی حمایت اور مخالفت میں رنگے ہوئے دکھائی دینے لگے۔

پاکستان کی تحریک کے مقابلہ کے لئے چند نئی تحریکیں اور پیدا ہو گئیں۔ پنجاب میں سکھستان کی تحریک نے جنم لے لیا۔ مسٹر کنہیا لال منشی نے بمبئی سے اکھنڈ بھارت کی تحریک شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں پاکستان اور اکھنڈ بھارت کے سلسلہ میں ایک مستقل کشمکش جاری ہو گئی۔

جاپان کا حملہ اور کرپس مشن

یورپ میں بدستور جنگ جاری تھی۔ انگریزوں کو ہر مورچہ پر شکست ہو رہی تھی۔ فرانس کا خاتمہ بالخیر ہو چکا تھا کہ اچانک جنوری ۱۹۴۲ء میں جاپان بھی انگریزوں کے خلاف جنگ میں شریک ہو گیا۔ ۱۵ فروری ۱۹۴۲ء کو اس نے سنگاپور کے اہم ترین مورچہ پر قبضہ جما لیا۔ اس کے بعد اس نے رنگون اور انڈمان کو بھی زیر کر لیا۔ اپریل ۱۹۴۲ء میں وزیگاپٹم اور کوکناڈا پر جاپانیوں کی بم باری شروع ہو گئی۔ سوبھاش بابو پُر اسرار طریقہ پر ہندوستان سے فرار ہو کر انگریزوں کے دشمنوں سے مل گئے اور آزاد ہند فوج بنا کر ہندوستان کی فتح کے لئے میدان میں آ گئے۔

برطانوی مدبرین نے یہ رنگ دیکھا تو انھوں نے سوچا کہ اب ہندوستان ہاتھ سے چلا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۲ء میں سر کرپس کو جدید اصلاحات دے کر ہندوستان بھیجا گیا۔ تاکہ وہ جدید اصلاحات کے ذریعہ ہندوستانیوں کو جاپان کے خلاف لڑنے کے لئے ہموار کر سکیں۔ کرپس اپنے ساتھ

اصلاحات کا جو مسودہ لے کر آئے تھے اُس کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) اختتام جنگ کے بعد ہندوستان کو مکمل آزادی دیدی جائے گی۔

(۲) اقوام اور مذاہب کے تحفظ کی ذمہ داری سردست برطانیہ پر رہے گی۔

(۳) اختتام جنگ کے بعد مجالس آئین ساز کے انتخابات ہوں گے۔ اور دستور ساز اسمبلی کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

(۴) جدید دستور وفاقی ہوگا۔ یعنی تمام صوبے ایک یونین سے وابستہ ہوں گے۔

(۵) مجلس دستور ساز کا منظور شدہ آئین ہندوستان کا دستور قرار دیا جائے گا۔

(۶) ہر صوبے اور ہر ریاست کو یہ حق ہوگا کہ وہ یونین میں شرکت کے دس سال بعد اگر چاہے تو یونین یا وفاق سے اپنا تعلق منقطع کرلے۔ اس طرح الگ ہونے والے صوبے اور ریاستیں اگر چاہیں اپنا جُداگانہ وفاق یا یونین بنا سکتے ہیں۔

(۷) تا اختتام جنگ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ رہے گا۔

(۸) محکمہ دفاع بدستور وائسرائے ہند کے ماتحت رہے گا۔

(۹) یہ تجاویز تمام و کمال یا تو منظور کی جائیں گی یا مسترد۔ ان میں ترمیم اور تغیر نہیں ہو سکتا۔

کانگریس کرپس تجاویز سے اس لئے کبیدہ خاطر ہوگئی۔ کیونکہ اس میں صوبوں کی علحدگی کا حق دے کر اور جُداگانہ وفاق کی سفارش کر کے مبہم طریقہ پر پاکستان کو مان لیا گیا تھا۔ لیگ کرپس تجاویز سے اس لئے مطمئن نہیں تھی۔

کیونکہ ان تجاویز کے ذریعہ نہ تو واضح طور پر پاکستان کو مانا گیا تھا اور نہ مسلمانوں کو صاف الفاظ میں جداگانہ قوم تسلیم کیا گیا تھا۔ چنانچہ کانگریس اور لیگ دونوں نے کرپس تجاویز کو مسترد کر دیا۔ اور سر کرپس ناکام و نامراد لندن واپس چلے گئے۔

"ہندوستان خالی کرو" کی تحریک

سر کرپس کے ہندوستان سے واپس جانے کے فوراً ہی بعد ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ایک جلسہ منعقد ہوا، اور اس جلسہ میں ایک تجویز منظور کی گئی جس میں انگریزی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ "فوراً ہندوستان خالی کر دے" اور گاندھی جی کو حق دیا گیا کہ انگریز اگر اس حکم کی تعمیل نہ کریں تو وہ فوراً انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے ایک تحریک جاری کر دیں۔

"ہندوستان خالی کرو" کی تجویز کا پاس ہونا تھا کہ حکومت نے ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو گاندھی جی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا۔ ان گرفتاریوں سے سارا ہندوستان مشتعل ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہایت وسیع پیمانہ پر توڑ پھوڑ۔ آتش زنی۔ بلوے اور فساد کی تحریک بجلی کی سرعت کے ساتھ سارے ملک میں پھیل گئی۔ عوام تشدد پر اتر آئے۔ انگریزوں پر حملے ہونے لگے۔ سرکاری دفاتر اور سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دی گئی۔ تار کاٹ دیئے گئے۔ ریل کی پٹریاں اکھاڑ کر پھینک دی گئیں۔ ٹراموں۔ بسوں اور موٹروں پر سنگ باری کی گئی۔ جا بجا بموں کے دھماکے سنائی دینے لگے غرضکہ سارے ملک میں ایک قیامت برپا ہو گئی۔

حکومت کی مشینری بھی فوراً حرکت میں آ گئی۔ ہندوستانیوں پر گولیاں برسائی گئیں۔ ٹینکوں اور آرمرڈ کاروں سے حریت پرستوں کا مقابلہ کیا گیا۔ غرضکہ

انتہائی سختی سے کام لے کر اس تحریک کو کچل دیا گیا۔

یوروپ کی جنگ کا خاتمہ اور ویول پیشکش

"ہندوستان خالی کرو" کی متشددانہ تحریک کے بعد حالات رفتہ رفتہ آگے بڑھتے رہے جن میں سے اہم واقعات یہ ہیں۔ گاندھی جی کا رہائی کے لئے برت۔ نظر بندی کی حالت میں گاندھی جی کی مسٹر جناح سے مصالحانہ گفتگو کے لئے خط وکتابت۔ مسٹر جناح پر بمبئی میں قاتلانہ حملہ۔ دو قوموں کے نظریہ کی بنا پر کانگریس اور لیگ میں سخت ترین کشاکش۔ صوبہ سرحد کا لیگ سے انحراف سر سکندر حیات کے مرنے کے بعد خضر حیات کی سرکردگی میں صوبہ پنجاب کی لیگ سے کامل بغاوت۔ راجہ جی کا فارمولا۔ ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی اور مسٹر جناح کی بے نتیجہ ملاقات۔ غرضکہ حالات تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے اور ملک میں یکے بعد دیگرے نہایت اہم واقعات رونما ہوتے رہے۔

لارڈ ویول جب ہندوستان کے وائسرائے ہوئے تو انھوں نے ہندوستان کی سیاسیات میں اہم حصہ لینا شروع کر دیا۔ ان ہی کے دور حکومت میں "ڈیسائی لیاقت" فارمولا بنا تھا جس کی رو سے کانگریس اور لیگ نے مشترکہ حکومت بنانے کی تجویز منظور کر لی تھی۔ چنانچہ ہی ۱۹۴۵ء میں جب جرمنی کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد یورپ کی جنگ عظیم ختم ہو گئی اور انگریزوں کو اطمینان میسر ہوا تو لارڈ ویول وہ "ڈیسائی لیاقت فارمولا" لے کر لندن گئے اور وہاں سے واپس آ کر "ویول پیش کش" یعنی اپنی تجاویز کا وہ مسودہ ملک کے سامنے پیش کر دیا جس کو کہ "ڈیسائی لیاقت فارمولا" کی روشنی میں تیار کیا گیا تھا۔ لارڈ ویول کی تجاویز کا خلاصہ یہ تھا۔

(۱) مرکزی وزارت میں اہم فرقوں کو نمائندگی حاصل ہوگی۔ جو اعلیٰ ذات

کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوی تعداد پر مشتمل ہوگی۔ یہ وزارت موجودہ دستور کے ماتحت کام کرے گی۔

(۲) وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے علاوہ ساری وزارت ہندوستانی ارکان پر مشتمل ہوگی۔ یہاں تک کہ اُمورِ خارجہ کا محکمہ بھی کسی ہندوستانی وزیر کے سپرد کیا جائے گا۔

(۳) اس جدید وزارت کی تشکیل چونکہ حکومت خود اختیاری کی طرف پہلا قدم ہے اس لئے اس کے وزرا کا انتخاب گورنر جنرل سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کے مشورہ سے کریں گے تاہم اُن کے تقرر کے لئے ہز مجسٹی کی توثیق لازمی ہوگی۔

(۴) چونکہ یہ وزارت موجودہ دستور کے ڈھانچہ کے اندر کام کرے گی۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہ ہو سکے گا کہ گورنر جنرل اپنے مخصوص اختیارات کو استعمال نہ کرے لیکن اس اختیار کو بے جا استعمال نہیں کیا جائے گا۔

(۵) یہ واضح کر دیا جاتا ہے کہ اس عارضی حکومت کی تشکیل جدید دستوری سمجھوتہ پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہوگی۔

ویول پیش کش کے فوراً ہی بعد وائسرائے اور مسٹر جناح میں خط و کتابت شروع ہو گئی۔ ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو کانگریس کے تمام مقتدر لیڈروں کو رہا کر دیا گیا۔ تاکہ کانگریسی لیڈر آزادی کے ساتھ اس جدید پیش کش کے بارے میں غور و خوض کر سکیں۔

پہلی شملہ کانفرنس

ہندوستان کے تقریباً تمام جماعتوں کے لیڈر چونکہ ویول پیشکش کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے تھے۔ اس لئے ۲۵ جون ۱۹۴۵ء کو شملہ میں کانگریس لیگ اور ہندوستان کی دوسری سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی تاکہ اس کانفرنس کے

ذریعہ ویول پیشکش کی آخری منظوری پر مہر تصدیق ثبت کردی جائے۔

یہ کانفرنس شروع شروع میں تو نہایت خوشگوار فضا میں کام کرتی رہی۔ لیکن آخر میں جاکر اس کانفرنس میں اس لئے جمود پیدا ہوگیا کیونکہ لارڈ ویول نہ تو مسٹر جناح کو آگے چل کر پاکستان قائم کرنے کے سلسلہ میں اطمینان دلا سکے۔ اور نہ انھوں نے مسلم وزرا کے تقرر کے معاملہ میں لیگ کی واحد نمائندگی تسلیم کی۔ بلکہ وہ اس امر پر یہ چاہتے تھے کہ لیگ کے کوٹے میں سے ایک وزیر کم کرکے خضر حیات وزیراعظم پنجاب کی پارٹی کے کسی مسلمان کو وزیر بنادیا جائے۔

مسٹر جناح کے نزدیک لارڈ ویول کا یہ اقدام "ڈیسائی لیاقت فارمولا" کے خلاف تھا کیونکہ اس فارمولے کی رُو سے لیگ کے لئے مساوی نشستیں تجویز کی گئی تھیں اور یہ قرار پایا تھا کہ تین نشستیں اقلیتوں کو یعنی اچھوتوں سکھوں اور عیسائیوں کو دی جائیں گی جن کا تقرر کانگریس اور لیگ کے مشورہ سے ہوگا۔ لیکن لارڈ ویول نہ تو لیگ کو کانگریس کی برابر نشستیں دینے پر تیار رہے اور نہ انھوں نے اقلیتوں کے نمائندوں کی نامزدگی کے معاملہ میں لیگ کا مشورہ لینا ضروری سمجھا۔ اس لئے مسٹر جناح نے ویول پیشکش کو مسترد کردیا۔ اور اس کے مسترد ہونے کے بعد لیگ اور کانگریس کے اتحاد کی آخری اُمید بھی ختم ہوگئی۔

انتخابات کا طوفان

شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد حکومت برطانیہ نے عام انتخابات کا اعلان کردیا۔ تاکہ ان انتخابات کے نتائج کے بعد ہندوستان کی مختلف سیاسی پارٹیوں کی قوت کا اندازہ ہو سکے۔

سب سے پہلے مرکزی اسمبلی کے انتخابات شروع ہوئے۔ مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں کانگریس نے ۱۰۱ نمائندے کھڑے کئے جن میں سے ۵۵ کامیاب ہوگئے

یعنی کانگریس کو نہایت ہی شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ لیگ نے ۳۰ مسلم نشستوں کے لئے اپنے ۳۰ نمائندے کھڑے کئے تھے۔ جو سب کے سب کامیاب ہو گئے۔ گویا لیگ کو مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں سو فی صدی کامیابی حاصل ہوئی۔

اسی طرح صوبائی مجالس قانون ساز کے لئے کانگریس اور لیگ دونوں نے اپنے اپنے نمائندے کھڑے کئے۔ کانگریس کو صوبوں میں بھی شاندار کامیابی ہوئی اور لیگ بھی تقریباً ہر صوبہ میں بڑی اکثریت کے ساتھ صوبائی انتخابات میں کامیاب ہوئی۔ کانگریس اور لیگ کے شاندار نتائج نے یہ چیز صاف طور پر واضح کر دی کہ ملک کی صرف یہی دو سیاسی پارٹیاں ہیں جن کو ملک کی قیادت اور رہنمائی کا حق حاصل ہے۔

انتخابات کا نتیجہ اگرچہ لیگ کے حق میں تھا۔ لیکن اس کے باوجود مسلم لیگ بجز بنگال کے اور کسی صوبہ میں مضبوط لیگی وزارت نہ بنا سکی۔ صوبہ سرحد میں چونکہ تقریباً آدھے مسلم ممبر مسلم نیشنلسٹ پارٹی یا کانگریس کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔ اس لئے سرحد میں کانگریسی وزارت بن گئی۔ صوبہ سندھ میں لیگی وزارت بن تو گئی مگر وہ متزلزل تھی۔ پنجاب کی حالت یہ تھی کہ خضر حیات نے صرف پانچ نشستیں حاصل کرنے کے بعد کانگریس اور سکھوں سے مل کر انگریز گورنر کی مدد سے اپنی وزارت بنالی۔ جس سے پنجاب میں شدید ہیجان برپا ہو گیا جس نے بڑھتے بڑھتے نہایت خطرناک صورت اختیار کر لی۔ خضر کا یہ فتنہ ملک کے لئے کس طرح تباہی کا موجب بنا اس پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔

وزارتی مشن کی آمد

ہندوستان کے لئے چونکہ جدید اصلاحات کا زمانہ قریب آرہا تھا۔ اس لئے حکومت برطانیہ نے اپنی سابقہ روایات کے مطابق جنوری ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کے سیاسی

حالات کا جائزہ لینے کے لئے "پارلیمنٹری مشن" کے نام سے ایک مشن ہندوستان بھیجا جو ہندوستان کے مقتدر لیڈروں سے تبادلہ خیال کرنے کے بعد فروری ۱۹۴۶ء میں لندن واپس چلا گیا۔ اور اس نے اپنی رپورٹ انگلستان کے زعماء کے سامنے پیش کر دی

پارلیمنٹری مشن کے فوراً ہی بعد لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند کی سرکردگی میں انگلستان کے وزرا کا ایک وفد مارچ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان پہنچ گیا۔ اس مشن کے ممبر یہ تھے۔ لارڈ پیتھک لارنس۔ وزیر ہند سر اسٹیفورڈ کرپس وزیر تجارت۔ مسٹر اے وی الگزنڈر وزیر محکمہ بحری۔ ان تینوں وزیروں کی آمد کا مقصد یہ تھا کہ وہ ہندوستان کے مقتدر سیاسی لیڈروں سے تبادلہ خیال کے بعد اس برعظیم کے لئے کوئی ایسا دستور مرتب کریں۔ جو ہندوستان کی تمام بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کے لئے قابل قبول ہو سکے۔ ان تین ممبروں کے علاوہ اس مشن کے چوتھے ممبر لارڈ ویول وائسرائے ہند تھے۔ جو ان کے ساتھ دستور سازی کے کام میں شامل ہو گئے تھے۔

دوسری شملہ کانفرنس بھی ناکام

مشن نے دہلی پہنچتے ہی ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے گفت و شنید شروع کر دی۔ گاندھی جی مسٹر جناح۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ اور دوسرے مقتدر لیڈروں سے کئی کئی بار ملاقات کرنے کے بعد مشن نے یہ طے کیا کہ شملہ میں ایک سہ پارٹی کانفرنس منعقد کی جائے اور اس کانفرنس کے ذریعہ مختلف پارٹیوں کے لیڈروں کو کسی نئے دستور کے سلسلہ میں متحد کرنے کی ہر امکانی کوشش کی جائے۔

مشن کی تجویز کے مطابق مئی ۱۹۴۶ء میں شملہ میں سہ پارٹی کانفرنس

منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس کے لئے سب سے بڑی دشواری یہ درپیش تھی کہ کانگریس نہ تو پاکستان کے اُصول کو تسلیم کرنے کے لئے تیار تھی۔ اور نہ دو جداگانہ قوموں کے نظریہ کو اس کے برخلاف مسٹر محمد علی جناح لیگ کی جانب سے اس بات پر اَڑے ہوئے تھے کہ پہلے پاکستان کے اُصول کو تسلیم کرو۔ چنانچہ مسٹر جناح اور پنڈت نہرو میں مصالحت کی غرض سے ۱۱ مئی ۱۹۴۶ء کو ایک اہم ملاقات بھی ہوئی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر ۱۲ مئی ۱۹۴۶ء کو اس دوسری شملہ کانفرنس کی ناکامی کا سرکاری طور پر اعلان کر دیا گیا۔

وزارتی مشن کا مجوزہ دستور

شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد وزارتی مشن نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ "اگرچہ سہ پارٹی کانفرنس ختم ہو گئی۔ لیکن کانفرنس کے خاتمے کے یہ معنی نہیں کہ ملک معظم کی حکومت نے جو کام شروع کیا تھا وہ بھی ختم ہو گیا" گویا اس اعلان کا یہ مطلب تھا کہ وزارتی مشن دستور سازی کے کام کو ہر حالت میں پایۂ تکمیل کو پہنچائے گا۔ چنانچہ ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن نے اپنا فیصلہ یعنی جدید دستور کا خاکہ شائع کر دیا جو یہ تھا۔

"ہم نے پوری کوشش کی کہ دونوں اہم پارٹیاں (کانگریس اور لیگ) ہندوستان کے اتحاد یا تقسیم کے مسئلہ پر کسی متفقہ نتیجہ پر پہنچ جائیں۔ لیکن اس کے باوجود کہ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ کافی مراعات اختیار کرنے کے لئے تیار تھیں پھر بھی ایک معمولی سی خلیج باقی رہ گئی جس کو پاٹا نہ جا سکا۔"

"ہم نے طے کیا ہے کہ ہندوستان کے آئندہ آئین کی تشکیل کے انتظامات فوراً کئے جائیں اور عارضی حکومت بھی فوری طور پر قائم کر دی جائے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ عوام کے چھوٹے بڑے ہر طبقہ کے ساتھ انصاف ہو۔"

"مسلم لیگ کے علاوہ سب کی خواہش ہے کہ ہندوستان متحد رہے۔

لیکن لیگ ہندوستان کی تقسیم چاہتی ہے۔ ہم نے بھی ہندوستان کی تقسیم کے امکانات کی اچھی طرح تحقیق کی ہے۔ مسلم لیگ کے دعوے کے مطابق ایک جداگانہ بالادست پاکستانی ریاست ہونی چاہیئے۔ جو دو رقبوں پر مشتمل ہو پاکستان کے ان دونوں رقبوں میں غیر مسلم اقلیت بہت کافی ہے۔ یعنی بلاک نمبر (۱) جس میں بلوچستان بھی شامل ہے۔ غیر مسلم اقلیت ۹۳ ر ۳۷ فیصدی اور بلاک نمبر (۲) میں ۳۱ ر ۴۸ فی صدی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر مسلم لیگ کے دعوے کے مطابق پاکستان قائم کر دیا جائے تو بھی فرقہ وارانہ اقلیتوں کے مسئلے طے نہ ہوں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلم اکثریت کے چھوٹے علاقوں کا پاکستان کہاں تک قابل عمل ہے۔ ایسے پاکستان کو خود مسلم لیگ بھی ناقابل عمل سمجھتی ہے۔ اس لئے ہمیں مجبوراً اس نتیجہ پر پہنچنا پڑا ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل نہ تو ایک بالادست پاکستان سے ہوتا ہے اور نہ چھوٹے بالادست پاکستان سے ہی ہوسکتا ہے۔"

"مندرجہ بالا وجوہ کے علاوہ انتظامی۔ اقتصادی اور فوجی وجوہ بھی کافی وزن رکھتی ہیں۔ ہندوستان کا ٹرانسپورٹیشن (نقل وحمل) ڈاک وتار کا سسٹم متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کو الگ کرنے سے ہندوستان کے دونوں حصوں کو شدید نقصان پہنچے گا۔ ہندوستان کی مسلح فوجیں بھی پورے ہندوستان کے لئے تیار کی گئی ہیں۔ اور ان کو دو حصوں میں تقسیم کر دینے سے دیرینہ روایات پر کاری ضرب پڑیگی اسکے علاوہ مجوزہ پاکستان کے دونوں ہندوستان کی دو نہایت کمزور سرحدوں پر مشتمل ہیں۔ اس لئے کامیاب تحفظ کے لئے پاکستان کا علاقہ رقبہ کے لحاظ سے کافی نہیں ہوگا۔"

"یہ فیصلہ اگرچہ ہم نے بہت غور وخوض کر کے کیا ہے لیکن پھر بھی یہ فیصلہ مسلمانوں کے اِن حقیقی خدشات کی طرف سے ہماری آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ کہ اُن کا تمدن اور ان کی سیاسی وسماجی زندگی ایک ایسے متحدہ ہندوستان میں مدغم ہو جائے گی جس میں کہ ہندوؤں کو زبردست اکثریت اور غلبہ حاصل ہے"۔

"یہ بالکل صاف بات ہے کہ برطانوی ہند کے آزادی حاصل کرنے کے بعد خواہ وہ دَولتِ مشترکہ میں شامل رہے۔ یا اس سے باہر رہے۔ وہ رشتہ جو اس وقت ریاستی حکمرانوں اور تاجِ برطانیہ کے درمیان موجود ہے۔ باقی نہیں رہے گا۔ ان سب وجوہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اب ہم ایک ایسے حل کی نوعیت پیش کرتے ہیں جو ہمارے خیال میں تمام پارٹیوں کے ضروری مطالبات کے مطابق اور ساتھ ہی تمام ہندوستان کے لئے ایک مستحکم اور قابلِ عمل آئین ہو گا۔"

(۱) ہندوستان کی ایک یونین قائم کی جائے جس میں برطانوی ہندوستان اور ریاستیں شامل ہوں اور جس کے ماتحت اُمورِ خارجہ۔ دفاع اور رسل و رسائل ہوں۔ نیز اس یونین کو اختیار ہو کہ وہ ان شعبوں کے اخراجات کے لئے مطلوبہ مالی وسائل مہیا کرے۔

(۲) یونین ایک ایگزیکٹو اور ایک قانون ساز اسمبلی پر مشتمل ہو۔ جس میں برطانوی ہندوستان اور دیسی ریاستوں کے نمائندے شامل ہوں۔ اس اسمبلی میں ہر اہم فرقہ وارانہ سوال کے تصفیہ کے لئے ضروری ہو گا کہ نہ صرف تمام ممبروں کی اکثریت سے فیصلہ ہو بلکہ دونوں بڑے فرقوں میں سے ہر ایک فرقہ کی جُداگانہ اکثریت کا فیصلہ کے حق میں ہونا بھی ضروری ہو گا۔

(۳) تمام صوبوں اور ریاستوں کو اُمورِ خارجہ، دفاع اور رسل و رسائل کو چھوڑ کر باقی ماندہ تمام شعبوں میں کامل آزادی اور اختیار حاصل ہو۔

(۴) صوبوں کو اس بات کی بھی آزادی حاصل ہوگی کہ وہ اگر چاہیں تو اپنے گروپ بنالیں اور ہر گروپ کی اپنی اپنی ایگزیکٹیو اور مجلس آئین ساز علحدہ ہوسکتی ہے اور ہر گروپ یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ صوبائی صیغوں میں سے کون کون سے صیغوں کا مشترکہ انتظام ہوگا۔

(۵) یونین اور گروپوں کے آئین میں ایک ایسی شرط ضرور ہو جس کے ذریعہ کوئی صوبہ اگر چاہے تو اپنی مجلس قانون ساز کی کثرت رائے سے پہلے دس سال کے بعد یا ہر دس کے وقفہ کے بعد اپنے آئین میں تبدیلی کرانے کا مطالبہ پیش کرسکے۔

مجلس آئین ساز:۔ اب ہم مجلس آئین ساز کے متعلق بتاتے ہیں جس کی تشکیل فوراً ہوجانی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال نمائندوں کے انتخاب کا ہے لیکن اس طرح دیر ہوگی۔ اس لئے موجودہ صوبائی اسمبلیوں میں سے منتخب شدہ ممبر لے لئے جائیں لیکن اسمبلیوں کے ممبروں کی تعداد آبادی کی صحیح نمائندہ نہیں ہے۔ اس لئے نہایت توجہ اور غور کے بعد جو تمام خامیوں کا ازالہ کردے گا۔ ہم نے یہ طریقہ سوچا ہے کہ آبادی کی صحیح تعداد کے اعتبار سے نشستیں دی جائیں مثلاً دس لاکھ پر ایک نشست۔

صوبوں میں نشستوں کی تقسیم۔ وہاں کے بڑے فرقوں کے تناسب سے کردی جائے۔ ہر صوبہ کی اسمبلی میں ہر فرقہ کے نمائندہ کا انتخاب۔ اُسی فرقہ والے عمل میں لائیں گے۔

صوبوں کی تقسیم:۔ مشن نے صوبوں کو جن تین سیکشنوں میں تقسیم کیا ہے وہ

یہ ہیں:-

(الف) گروپ سیکشن اے (یعنی ہندو گروپ) میں یوپی سی پی مدراس بمبئی۔ بہار اور اڑیسہ شامل تھے۔

(ب) سیکشن بی (یعنی مسلم گروپ ۱) میں پنجاب۔ صوبہ سرحد اور سندھ شامل ہیں۔

(ج) سیکشن سی (یعنی مسلم گروپ ۲) میں آسام اور بنگال شامل ہیں۔

یہ تینوں سیکشن اگر چاہیں گے تو اپنے اپنے متعلقہ صوبوں کے گروپ کا دستور مرتب کریں گے۔ اسلامی اکثریت والے صوبوں کے گروپ کو ہندو اکثریت والے صوبوں کے دستور میں مداخلت کا حق نہ ہوگا۔ اسی طرح ہندو اکثریت والے صوبوں کے گروپ کو مسلم اکثریت والے صوبوں کے دستور میں مداخلت کی اجازت نہ ہوگی۔ دہلی۔ اجمیر اور کورگ کا ایک ایک نمائندہ اے سیکشن (یعنی ہندو گروپ) میں شامل ہوگا۔ اور بلوچستان کا ایک نمائندہ بی سیکشن (یعنی مسلم گروپ ۱) میں شامل ہوگا۔

صوبوں کا دستور بن جانے کے بعد دستور ساز مجالس کے تمام اراکین یونین یعنی مرکز کا دستور بنائیں گے۔ اس سلسلہ میں فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق محض عام اکثریت کی رائے کافی نہیں ہوگی۔ بلکہ مختلف فرقوں کی علحدہ علحدہ اکثریت کی حمایت بھی ضروری ہوگی۔

عارضی حکومت کا قیام

وزارتی مشن نے اپنی تجاویز میں یہ بھی سفارش کی تھی کہ جب تک نیا آئین نافذ ہو۔ اس وقت تک کے لئے درمیانی عرصہ کے واسطے مختلف سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں پر مشتمل مرکز کی ایک عارضی حکومت قائم کردی جائے چنانچہ

مسلم لیگ اور کانگریس جو دونوں ہی بڑی حد تک وزارتی اسکیم کو منظور کر چکی تھیں۔ ان کو وائسرائے ہند لارڈ ویول نے وزارتی مشن کی تجویز کے مطابق مرکز میں عارضی حکومت قائم کرنے کی دعوت دے دی۔

وائسرائے کی اس دعوت کے بعد فرقہ وارانہ نمائندگی اور چند دوسرے معاملات پر آپس میں کچھ ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں کہ کانگریس اور لیگ کے لیڈر عارضی حکومت میں شامل نہ ہوئے۔ لہٰذا وائسرائے نے چھ انگریز ممبروں اور دو ہندوستانی وزیروں کی ایک "کام چلاؤ" وزارت بنا دی۔

قومی لیڈروں کی وزارت

مرکز میں "کام چلاؤ" وزارت کے قیام کے بعد وائسرائے ہند اور ہندوستانی لیڈروں میں وزارت کے بارے میں پھر مشاورت کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لیگ تو وزارت میں شامل ہونے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ مگر کانگریس وزارت بنانے پر آمادہ ہو گئی۔ چنانچہ کانگریس نے ستمبر ۱۹۴۶ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی سرکردگی میں مرکز میں کانگریسی وزارت بنا لی۔

کانگریس کے وزارت قبول کرنے کے بعد وائسرائے ہند اور لیگی لیڈروں میں دوبارہ تبادلہ خیال شروع ہوا۔ اور وائسرائے نے لیگ کو بھی مرکزی وزارت میں حصہ لینے پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ مرکز میں چودہ وزیروں کی کیبنٹ بن گئی۔ جس میں چھ وزیر کانگریس کے تھے۔ جن میں ایک مسلمان نیشلسٹ اور ایک اچھوت وزیر بھی شامل تھا۔ لیگ کے پانچ وزیر تھے۔ جس میں ایک اچھوت وزیر بھی تھا۔ تین وزیر اقلیتوں کے تھے یعنی ایک سکھ وزیر۔ ایک پارسی وزیر اور ایک ہندوستانی عیسائی وزیر۔ پنڈت جواہر لال نہرو بدستور کیبنٹ کے وزیر اعظم رہے۔

قومی وزراء میں رسہ کشی

مرکز میں کانگریس۔ لیگ اور اقلیتوں کے نمائندوں

کی وزارت بن جانے کے بعد یہ توقع کی جا رہی تھی کہ اب شاید ہندوستان کی مختلف پارٹیوں میں مستقل اتحاد ہو جائے۔ لیکن گذشتہ واقعات نے کانگریس اور لیگ میں اس قدر کشیدگی اور بداعتمادی پیدا کر دی تھی کہ ان دونوں بڑی جماعتوں کے وزارت میں شامل ہونے کے باوجود بھی حالات دن بدن بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔

قومی لیڈروں کی ملی جلی وزارت بظاہر تو عارضی حکومت کا کام چلا رہی تھی لیکن اندرونی طور پر کیبنٹ کے کانگریسی اور لیگی وزرا میں بُری طرح رسہ کشی جاری تھی۔ اور یہ رسہ کشی بعض اوقات اس قدر بڑھ جاتی تھی کہ پوری کی پوری کیبنٹ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا تھا۔ غرضکہ کانگریس اور لیگ میں جو کشیدگی کہ ایوان وزارت سے باہر تھی۔ اُس سے کہیں زیادہ خود وزارت کے اندر پیدا ہو چکی تھی

ہندوستان کی تقسیم کی جانب قدم

معاملات دن بدن بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ کانگریسی اور لیگی وزرا کے اختلافات روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ کانگریسی وزرا کو شکایت تھی کہ لیگی وزرا وزارت کا کام بٹانے کے لئے نہیں بلکہ اُسے تباہ کرنے کے لئے شامل ہوئے ہیں۔ لیگی وزرا کو شکوہ تھا کہ کانگریس نے اُمور خارجہ ڈیفنس۔ ہوم اور تمام اہم محکموں پر تو خود قبضہ جما لیا ہے اور اُن کو محض نام کے لئے وزیر بنا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ لیگی لیڈروں کو یہ بھی شکایت تھی کہ کانگریس نے وزارتی مشن سے اُس گروپنگ سسٹم کو ختم کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ جسے کسی نہ کسی حد تک پاکستان کا بدل سمجھا جا سکتا ہے۔ غرضکہ کانگریس اور لیگ میں بڑی طرح کھینچا تانی جاری تھی

اسی دوران میں "دستور ساز اسمبلی" کا ایک نیا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ کانگریس چاہتی تھی کہ جلد سے جلد دستور ساز اسمبلی منعقد کرنے کے بعد ملک کے لئے آئندہ دستور بنانے کا کام شروع کر دے۔ مگر لیگی حلقے دستور سازی کے حق میں نہ تھے۔ چنانچہ کانگریس نے جب مسلم لیگ کے ایما کے بغیر دستور سازی کا ابتدائی کام شروع کر دیا۔ تو مسلم لیگ نے دستور سازی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ اس جھگڑے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں جماعتوں میں اور بھی زیادہ کشیدگی بڑھ گئی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن تقسیم ہند کے حق میں

عین اسی زمانہ میں جبکہ کانگریسی اور لیگی لیڈروں میں یہ کشمکش جاری تھی۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں لارڈ ویول کے جانے کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے چارج لیتے ہی کانگریسی اور لیگی لیڈروں کی اس جدید وائسرائے سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں اور دونوں ہی پارٹیوں نے اُس وزارتی پلان کو ناقابلِ عمل بتانا شروع کر دیا۔ جس کو کہ یہ دونوں مقتدر جماعتیں اس سے پہلے منظور کر چکی تھیں۔

انگریز ہمیشہ اس قسم کے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستانی لیڈروں کی خانہ جنگی سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے فوراً لندن ہائی کمانڈ سے گفتگو شروع کر دی۔ اور اُس نے ایک ایسی نئی اسکیم فوراً بنا ڈالی جس کے ذریعہ ہندوستان پر ایک کاری اور آخری ضرب لگائی جا سکے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اسکیم یہ تھی کہ متحدہ ہندوستان کو پاش پاش کر کے اُس کی طاقت کو ختم کر دیا جائے۔ مسلمان چونکہ پاکستان کے لئے بضد ہیں۔ اس لئے ان کو ایک ایسا ناقص پاکستان دے دیا جائے۔ جسے یہ چلا ہی نہ سکیں یعنی پاکستان میں سے مشرقی پنجاب مغربی بنگال اور آسام کے اہم حصے کاٹ کر اسے

ناقابل عمل بنا دیا جائے۔ ادھر پاکستانی علاقہ کے نکل جانے کے بعد ہندوستان بھی کمزور ہو جائے۔ چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۳ رجون ۱۹۴۷ء کو اپنی اس اکیم کا اعلان کر دیا۔

کانگریس اور لیگ تقسیم کیلئے رضامند

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ۳ رجون ۱۹۴۷ء کے اعلان سے قبل ہی اخبارات کے ذریعہ چونکہ عوام کو اس جدید "ماؤنٹ بیٹن پلان" کا علم ہو گیا تھا۔ اس لئے عام خیال تھا کہ کانگریس اور لیگ دونوں جماعتیں اس ناقص پلان کو کبھی منظور نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ ایک طرف تو کانگریس ملک کی تقسیم کی اصولاً سخت مخالف ہے۔ دوسری طرف لیگ ایسے ناقص پاکستان کو کبھی قبول نہیں کر سکتی۔ جس کے اہم ترین حصے پاکستان سے علحدہ کر دئے گئے ہوں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۳ رجون ۱۹۴۷ء کو جب آل انڈیا ریڈیو پر اس ناقص پلان کا اعلان کیا اور اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر جناح نے اس ناقص پلان کو منظور کر لیا تو عوام یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ قومی لیڈروں نے بنیادی نقائص کے باوجود اس پلان کو کیوں منظور کر لیا۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ پلان بے حد ناقص تھا۔ اور اس کو دونوں جماعتوں کے مقتدر لیڈر بھی محسوس کرتے تھے۔ لیکن لیڈروں کے نزدیک حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ اب اس کے سوا اور کوئی دوسرا چارہ کار ہی نہ تھا۔ کہ اس اچھے یا برے پلان کو منظور کرنے کے بعد دو علحدہ علحدہ حکومتیں بنا دی جائیں۔ چنانچہ کانگریس ورکنگ کمیٹی اور لیگ کونسل کے اجلاس اس پلان پر غور کرنے کے لئے فوراً ہی منعقد ہوئے۔ اور ان دونوں مقتدر جماعتوں نے بعض ممبروں کے سخت اختلاف کے باوجود

اس ناقص پلان پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

دو آزاد حکومتوں کا قیام

جس زمانہ میں کہ یہ پلان منظور کیا گیا ہے۔ اسی زمانہ میں پنجاب میں شدید فرقہ وارانہ ہنگامے برپا تھے۔ ان ہنگاموں کی تفصیلات پر تو ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔ اس وقت تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ لیڈروں نے ملک کے نازک حالات کے پیش نظر جب ماؤنٹ بیٹن پلان کو منظور کر لیا تو اس پلان کی سفارشات کے مطابق ۱۵ اراگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دئے گئے اور اس کے ساتھ ہی آسام بنگال اور پنجاب کو بھی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور اس طرح اس برِ عظیم میں "انڈین یونین"۔ اور "پاکستان" کے نام سے دو آزاد مملکتیں عالم وجود میں آگئیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو جو پہلے ہی سے عارضی حکومت کے وزیر اعظم تھے۔ ان کو "انڈین یونین"۔ کا پہلا وزیرِ اعظم منتخب کیا گیا۔ اور انھوں نے اپنی جدید کیبنٹ مُرتب کر لی جس میں زیادہ تر وہی وزرا لئے گئے جو سابقہ عارضی حکومت میں تھے ماؤنٹ بیٹن کو وزارت ہند نے "انڈین یُونین"۔ کا گورنر جنرل مقرر کر دیا۔

"پاکستان"۔ چونکہ بالکل نیا ملک تھا۔ اس لئے اس کی جداگانہ کیبنٹ بنی۔ مسٹر جناح اس نئی مملکت کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ اور نوابزادہ لیاقت علی خاں وزیرِ اعظم منتخب ہوئے جنھوں نے کہ اپنی کیبنٹ مُرتب کر لی۔ پاکستان کے دارالسلطنت کے لئے کراچی کو منتخب کیا گیا۔

خوں ریزی اور قتلِ عام

یہ تاریخ نامکمل رہ جائے گی۔ اگر اس تباہکاری قتل و خون اور خوں ریزی کا تذکرہ نہ کیا جائے گا جو تقسیمِ ہند سے قبل اور اس کے بعد ہندوستان کے مختلف حصّوں میں برپا ہوئی

یا برپا کرائی گئی۔ ۱۹۴۷ء کی خونریزی کی داستان بیان کرنے سے پہلے ہم اُن سابقہ خونریزیوں کی تاریخ بیان کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں جو اس سے قبل ہوتی رہی ہیں تاکہ ۱۹۴۷ء کی خونریزی کے بُنیادی اسباب کے سمجھنے میں ناظرین کو سہولت ہو سکے۔

ہندوستان میں انگریزی دورِ حکومت کی تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ انگریزوں کے دورِ حکومت میں جب بھی اس بدنصیب ملک کو اصلاحات دی گئی ہیں تو یہ اصلاحات ہمیشہ اپنے ساتھ تباہی بربادی اور خونریزی کا طوفان ساتھ لے کر آئی ہیں۔ چونکہ برابر ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ اس لئے اسے اتفاق نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بلکہ اس سے صاف طور پر یہ واضح ہوتا ہے کہ انگریز نے جب بھی ایک ہاتھ سے اصلاحات عطا فرمائی ہیں تو دوسرے ہاتھ سے ملک میں ہنگامے بھی برپا کر دئے ہیں۔ تاکہ یہ دی ہوئی اصلاحات خود ہی فرقہ وارانہ ہنگاموں میں ختم ہو جائیں۔

۱۸۹۳ء کی اصلاحات کے بعد خونریزی:۔ ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۹۳ء کا سال وہ پہلا منحوس سال ہے جس میں کہ ہندوستان میں پہلی مرتبہ ہندو مسلم سوال پر فرقہ وارانہ ہنگامے برپا ہوئے۔ ورنہ اس سے قبل یہ ملک فرقہ وارانہ ہنگاموں کے نام تک سے نا آشنا تھا۔

یہ ہنگامے ۱۸۹۲ء کی اُن اصلاحات کے فوراً ہی بعد شروع ہو گئے تھے جن کی رو سے ہندوستانیوں کو دل بہلانے کے لئے نام نہاد کونسلوں کا کھلونا لندن پارلیمنٹ نے عطا کیا تھا۔ چنانچہ ان اصلاحات کے عطا ہوتے ہی ہندوستان کے باشندوں نے پوری آزادی کے ساتھ ایک دوسرے کا خون بہانا شروع کر دیا۔ ۱۸۹۳ء میں اعظم گڈھ اور ہندوستان کے دوسرے

مقامات پر قربانی گاؤ کو بہانہ بنا کر بقرا عید کے تہوار پر اچھی طرح سے خونریزی ہوئی۔ بمبئی میں تعزیوں کی آڑ لے کر ہندو مسلمانوں نے اچھی طرح سے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹیں۔ اسی زمانہ میں سب سے پہلے انگریز کے اشارہ پر اُردو اور ہندی کا جھگڑا کھڑا کیا گیا۔ ان واقعات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انگریز کی سیاست کیا تھی۔ اور وہ کس طرح ہندو مسلمانوں کو لڑا کر حکومت کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔

۱۹۰۹ء کی اصلاحات کا فتنہ :۔ ہونا تو یہی چاہیئے تھا کہ جس طرح سابقہ اصلاحات کے فوراً بعد فرقہ وارانہ ہنگامے شروع ہوگئے تھے۔ اسی طرح ۱۹۰۹ء کی اصلاحات کے بعد بھی ہندوستان میں خونریزی شروع ہوجاتی لیکن انگریز کی جادوگری اس لئے نہ چل سکی کیونکہ ان اصلاحات کے بعد مقتدر لیڈروں کی کوشش سے اتحاد کانفرنس کے ذریعہ ہندو اور مسلمان بڑی حد تک متحد ہوگئے تھے۔

مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ انگریز خاموش ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ انگریز نے ان اصلاحات سے قبل ہی ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کا ایک ایسا فتنہ کھڑا کر دیا تھا جو ہندو اور مسلمانوں میں بڑی سے بڑی خوں ریزی پیدا کرا سکتا تھا جب تقسیم بنگال کا یہ فتنہ سرسبز نہ ہوا تو انگریز نے ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کو منسوخ کر کے ایک اور ضرب لگائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات اور بھی کشیدہ ہوگئے۔

۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے بعد فسادات :۔ ہندوستان میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات ۱۹۲۱ء میں نافذ ہوئی تھیں۔ ان اصلاحات کے نفاذ سے قبل ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات اس قدر خوشگوار تھے کہ ان پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان اصلاحات کا نافذ ہونا تھا کہ انگریزوں کی جادوگری

کے طفیل میں اچانک ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔

۱۹۲۲ء میں ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ ایسی بھڑکی کہ وہ کئی سال تک ہندو اور مسلمانوں کو تباہ کرتی رہی۔ دونوں نے انتہائی بیدردی کے ساتھ ایک دوسرے کو ذبح کیا۔ اور یہ فرقہ وارانہ لعنت اس حد تک بڑھی کہ اس نے ہندوستان کی تقریباً تمام سیاسی تحریکوں کو ختم کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ گاندھی جی، مسٹر جناح اور ہندوستان کے دوسرے مقتدر لیڈر گوشہ نشینی پر مجبور ہو گئے۔

۱۹۳۵ء کی اصلاحات کے بعد قتل و خون: ۱۹۳۵ء کی وہ اصلاحات جن کی رُو سے صوبوں کو خودمختاری عطا کی گئی تھی۔ ابھی اس کا نفاذ بھی نہیں ہوا تھا کہ ۱۹۳۵ء میں پنجاب میں مسجد شہید گنج کا فتنہ کھڑا کر دیا گیا اور مسجد و گوردوارہ کے نام پر اچھی طرح سے خونریزی ہوئی۔

یہ تو ۱۹۳۵ء کی اصلاحات کے نفاذ سے قبل کی خونریزی کی پہلی قسط تھی لیکن اسکے بعد جب ۱۹۳۵ء میں اصلاحات نافذ ہو گئیں اور صوبائی وزارتیں بن گئیں تو ہندوستان کے تقریباً ہر صوبہ میں فرقہ وارانہ ہنگامے شروع ہو گئے۔ ہر جگہ مسجد۔ باجہ اور گائے کے نام پر انسانی خون بہایا جانے لگا غرضکہ ہندو مسلمانوں نے اصلاحات کے اس جدید تحفے کے بعد انگریز کے اشارہ پر خوب ایک دوسرے کی گردنیں کاٹیں۔

آزادی سے پہلے اور بعد کی خونریزی: ۱۹۴۷ء کی آزادی کی قسط چونکہ انگریز کی عطا کردہ اصلاحات کی آخری اور سب سے بڑی قسط تھی۔ اس لئے اس قسط کے ساتھ خونریزی اور تباہ کاری کی قسط بھی سب سے بڑی ہونی چاہئے تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

۱۹۴۶ء میں ابھی برائے نام ہی قومی حکومت مرکز میں قائم ہوئی تھی کہ بہار میں پوری بے دردی کے ساتھ اکثریت نے اقلیت کا خون بہانا شروع کر دیا۔

اور ایسی تباہ کاری برپا کی جس کے تصور سے بھی کلیجہ کانپ جاتا ہے۔

بہار کے بعد ۱۹۴۷ء کی خونریزی شروع ہوئی۔ ۱۹۴۷ء کی خونریزی کے افتتاح کا سہرا حکومتِ انگلشیہ کے فرزند و دلبند لفٹننٹ جنرل خضر حیات خاں اور پنجاب کے فرقہ پرست لیڈروں کے سر ہے جنہوں نے انگریز گورنر کی مدد سے پنجاب کی وزارت پر قبضہ جما کر صوبہ کے کروڑوں مسلمانوں کو مشتعل کر دیا چنانچہ خضر حیات کی وزارت کے خلاف سارے پنجاب میں شورش برپا ہو گئی۔ یہاں تک کہ خضر حیات کو وزارت کی کرسی چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

یہ حقیقت ہے اور اس حقیقت سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خضر حیات کی وزارت کے خلاف پنجاب میں جو تحریک جاری کی گئی تھی وہ نہایت پر امن تھی۔ چنانچہ خضر حیات کی وزارت کے خاتمہ تک پنجاب کے کسی حصہ میں بھی ہندو مسلم یا سکھ سوال پیدا نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اس پوری تحریک میں کسی غیر مسلم کو خراش تک نہیں آئی۔

پنجاب اور صوبہ سرحد میں تشدد کا دور: خضر حیات کی وزارت کے خاتمہ کے بعد پنجاب کا وہ جھگڑا ختم ہو گیا تھا جو مسلموں اور غیر مسلموں کا جھگڑا نہیں تھا۔ بلکہ آپس میں مسلمانوں ہی کی دو پارٹیوں کا جھگڑا تھا۔ لیکن انگریز کی عشوہ گری نے اس غیر فرقہ وارانہ جھگڑے کو فوراً فرقہ پرستی کی صورت دیدی۔ چنانچہ ماسٹر تارا سنگھ تلوار گھماتے ہوئے فوراً خم ٹھونک کر مسلمانوں کے مقابلہ پر کھڑے ہو گئے اور ملک کی بدقسمتی سے وہ جھگڑا جو مسلمانوں کی دو پارٹیوں میں جاری تھا۔ فوراً مسلم سکھ جھگڑا بن گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ ہر طرف تشدد۔ لاقانونی آتشزدگی اور قتل و خون کی آگ بھڑک گئی۔ جس نے بڑی تیزی کے ساتھ ہندو مسلم اور سکھ ہنگامے کی صورت اختیار کر لی۔ پُراسرار طریقہ پر ہندوؤں میں مسلمانوں میں اور

سکھوں میں ہتھیار تقسیم ہوتے رہے۔ اور یہ آگ بڑھتے بڑھتے پنجاب سے گزر کر صوبہ سرحد تک جا پہنچی۔

مشرقی پنجاب میں قتل و خون:۔ امرتسر اور چند دوسرے مقامات کو چھوڑ کر باقی مشرقی پنجاب ابھی تک پوری طرح اس تباہ کاری سے متاثر نہیں ہوا تھا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے اعلان آزادی کے بعد وہاں بھی یہ آگ پوری تیزی کے ساتھ بھڑک اٹھی۔ لاتعداد بے گناہ انسانوں کو تہہ تیغ کیا گیا۔ یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ بھی انتہائی ظلم کا سلوک کیا گیا۔ غرضکہ انگریز نے جو فتنہ کھڑا کیا تھا۔ اُس نے مغربی پنجاب۔ صوبہ سرحد اور مشرقی پنجاب کے لاکھوں انسانوں کو قتل کرا دیا اور لاکھوں کو بے گھر اور بے در کر دیا۔

ریاستوں میں تباہ کاری کی آگ:۔ پٹیالہ۔ نابھ۔ جیند۔ فرید کوٹ۔ کپورتھلہ کی سکھ ریاستوں کے علاوہ تباہکاری کی یہ آگ راجپوتانہ کی ریاستوں میں بھی پھیل گئی۔ چنانچہ الور۔ اندور۔ بھرتپور میں ریاستی سپاہیوں نے فرقہ پرست جماعتوں کے ساتھ بُری طرح سے قتل عام کیا۔ لوگوں کو گھروں سے بے گھر کیا۔ صرف جے پور ایک ایسی ریاست تھی جس نے کہ اس لعنتی ہنگامہ سے اپنے دامن کو داغدار نہ ہونے دیا۔

دہلی کے قرب و جوار میں تباہکاری:۔ وہی فتنہ پرداز جنھوں نے کہ مشرقی پنجاب میں غارتگری برپا کی تھی انھوں نے اس آگ کو دہلی کی طرف بڑھانا شروع کر دیا۔ چنانچہ نہ پانی پت بچا۔ نہ گوڑگانواں۔ نہ پلول کو چھوڑا گیا۔ نہ سونی پت غرضکہ اس سارے علاقہ کو جو مشرقی پنجاب اور دہلی کے درمیان تھا۔ تباہ کاری کے اعتبار سے دوسرا مشرقی پنجاب بنا دیا گیا۔ گویا انگریز اور اس کے پٹھوؤں کی لگائی ہوئی وہ آگ جو لاہور سے شروع ہوئی تھی دُور دُور پھیل گئی۔

خاص دہلی بھی نہ بچ سکی:۔ دہلی کے گرد و پیش میں جب فرقہ پرستی کا طوفان برپا تھا تو دہلی کے ہندو مسلمان باہمی اتحاد کی جدوجہد میں مصروف تھے اور یہ عام خیال تھا کہ بلوائیوں کو دہلی کی جانب رُخ کرنے کی جرأت نہ ہوگی لیکن آخر ماہ اگست ۱۹۴۷ء میں بجواسن کے حادثہ کے بعد دہلی کی فضا بھی بگڑنی شروع ہو گئی جس کے بعد ایک طویل کرفیو لگا دیا گیا۔ مگر فضا بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

۵ ستمبر ۱۹۴۷ء کو مسجد فتحپوری میں بم پھٹنے کے بعد دہلی میں بھی پوری تیزی کے ساتھ فرقہ پرستی کی آگ بھڑک اُٹھی۔ بلوائیوں کا شہر پر قبضہ تھا۔ حکومت اپنی تمام تر جدوجہد کے باوجود اس لئے لاچار تھی کیونکہ غیر ذمہ دار فوجیوں اور نا فرض شناس پولیس والوں کا ایک طبقہ فرقہ پرستی کے زہر سے متاثر ہو کر بلوائیوں کی مدد کر رہا تھا۔

نئی دہلی۔ سبزی منڈی۔ باڑہ ہندو راؤ۔ صدر قرول باغ۔ پہاڑ گنج۔ سول لائن کشمیری دروازہ اور دہلی کے دوسرے علاقوں پر ایک منظم پروگرام کے ماتحت یورش کر دی گئی۔ اقلیت کے طبقہ سے ان تمام علاقوں کو صاف کیا جانے لگا۔ غرضکہ ۹ ستمبر تک جامع مسجد۔ چتلی قبر۔ کوچہ چیلان۔ بلّی ماران۔ لال کنواں۔ فراشخانہ۔ اور پھاٹک حبش خاں کے علاوہ شہر کے تقریباً ہر حصہ سے اقلیت والے طبقہ کو نکال دیا گیا۔ اور ایسی تباہی مچی جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مفقود ہے۔

گاندھی جی کی دہلی میں آمد:۔ گاندھی جی اس تباہکاری کی اطلاع پاتے ہی فوراً دہلی کی طرف دوڑے۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو انھوں نے دہلی پہنچنے کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ مل کر اس آگ کو دبانے کی ہر امکانی کوشش کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا بلوائیوں کے خلاف غصہ اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ کئی موقعوں پر انھوں نے اپنی جان تک کو خطرہ میں ڈال دیا۔ چنانچہ جامعہ ملیہ اسلامیہ

کو بچانے کے لئے وہ تن تنہا بلوائیوں کے مقابلہ میں میدان میں آگئے۔ نئی دہلی میں انھوں نے بلوائیوں پر تنِ تنہا حملہ کر دیا۔ ادھر گاندھی جی نے فسادزدہ علاقوں میں خود جا کر حالات کے اصلاح کی ہر امکانی کوشش کی۔ ان کی براڈ کاسٹ تقریروں نے بلوائیوں کے حوصلوں کو پست کر دیا۔ غرضکہ رفتہ رفتہ دہلی کی حالت سنبھلنے لگی۔

تبادلہ آبادی کا سیلاب:۔ ہندوستان اور پاکستان کے ان حادثات نے چونکہ لوگوں میں بے اعتمادی پیدا کر دی تھی۔ اس لئے تبادلہ آبادی کا ایک سیلاب ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان کئی ماہ تک منتقل ہوتا رہا اور اس طرح انگریز اور ان کے پٹھوؤں کی فتنہ پردازی سے اس برِ عظیم کے لاکھوں انسان مارے گئے اور کروڑوں بے گھر و بے در ہو گئے۔

ہندوستان میں قتل و خون اور غارتگری کی اس طویل سرگزشت سے یہ اندازہ لگا لینا کوئی دشوار نہیں ہے کہ انگریز نے اصلاحات کی ہر نئی قسط کے ساتھ اس ملک میں کیسی فتنہ انگیزی برپا کی ہے۔ اور اس کی فتنہ انگیزی کی آخری قسط کس قدر ہولناک اور شرمناک تھی۔

آزاد مملکتوں کے لئے مشکلات تبدیلئ آبادی کے خلافِ توقع اور پیچیدہ مسئلہ نے ان دونوں مملکتوں کو سخت مشکلات میں مبتلا کر دیا تھا لیکن ۱۹۴۸ء کے وسط تک دونوں مملکتوں نے ان غیر متوقع مشکلات پر قابو پا لیا۔ اور وہ ان خطرات سے نکل گئیں۔ جن میں کہ ان کو انتہائی شرارت کے ساتھ مبتلا کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۴۸ء کا سب سے بڑا سانحہ جنوری ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کا بے دردانہ قتل ہے گاندھی جی کے اس سانحہ کے بعد ستمبر ۱۹۴۸ء میں مسٹر جناح بھی رحلت فرما گئے۔ دونوں مملکتوں نے اس نقصانِ عظیم کو بھی بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ برداشت کیا۔ غرضکہ دونوں

ہی مملکتوں کو اپنی پیدائش کے فوراً ہی بعد ایسی سخت مشکلات میں مبتلا کر دیا گیا تھا کہ بظاہر ان پر قابو پانا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ دونوں مملکتیں بڑی حد تک خطرات کے دَور سے نکل چکی ہیں۔ اور سخت رُکاوٹوں کے باوجود ترقی کی طرف گامزن ہیں۔

اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریز اس برِ صغیر میں گذشتہ ڈیڑھ سو برس تک فرقہ پرستی کا جو زہر پھیلاتا رہا ہے۔ وہ اب بھی کبھی کبھی ان دونوں مملکتوں کے لیے سخت پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔ لیکن وقت آئے گا جب یہ دونوں مملکتیں فرقہ پرستی کے زہر سے پاک ہو جائیں گی۔ اور ان کے باشندوں میں ایسی یگانگت اور محبت دکھائی دے گی کہ ایک ہندوستانی اور پاکستانی میں کوئی فرق اور امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ اور یہ دونوں آزاد مملکتیں خوب پھولیں گی، اور پھلیں گی۔

انقلاب زندہ باد
دورِ آزادی پائندہ باد

JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY
No.............
Date ....
SRINAGAR

طلال

مرحمت ڈاکٹر طلال

۱۱ رمئی سنہ ۲۰۰۶

ALLAMA
IQBAL LIBRARY
UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN

Jammu & Kashmir
iversity Library,
rinagar.

1. Overdue charge of *one anna* per-day will be charged for each volume kept after the due date.

2. Borrowers will be held responsible for any dam-
ge done to the book
ile in their possession.